ہفت روزہ
ندائے خلافت
لاہور
۷/ فروری ۱۹۹۵ء

☆ تحریکِ آزادیٔ ہند... ایک انگریز مصنف کا تجزیہ

☆ مذہبی رواداری کی آڑ میں سیکولرزم لانے کی ناپاک سازش

☆ بنگلہ دیش کے مصورین کا قصور پاکستان سے محبت ہی تو ہے!

حدیثِ امروز

وقتِ دعا ہے

رمضان المبارک کی آمد آمد ہے۔ اس کے دنوں اور راتوں میں قبولیتِ دعا کی ان گنت ساعتیں آئیں گی۔ پھر اسی میں لیلۃ القدر بھی تو ہے جب ربِ کریم کی رحمت کے دریا میں طغیانی کی کیفیت ہو گی۔ ہم میں سے جنہیں یہ ماہِ مبارک نصیب ہو رہا ہے وہ اپنی خوش بختی پر ناز تو ضرور کریں لیکن اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانے میں کسر رہ گئی تو یہ بڑے گھاٹے کا سودا ہو گا۔ یاد رکھئے ہمیں مانگنا تو سبھی کچھ اللہ سے ہے لیکن حضورِ رب میں گریہ و زاری کے ساتھ دو چیزوں کی بھیک کے لئے دامن ضرور پھیلائے رکھنا ہے۔ ایک اپنے لئے وہ موت جو اسلام کی روش نبھاتے ہوئے حالتِ ایمان میں ہو اور دوسرے اپنے وطن پاکستان کی خیر جو اسلام ہی کے نام پر خود اللہ تعالیٰ نے ہماری آہ و زاری اور عہد و پیان کے جواب میں اپنے خصوصی فضل سے ہمیں عنایت فرمایا۔

کسی کو معلوم نہ ہو تو سن رکھے کہ پاکستان کی ناؤ بھنور میں پھنس چکی ہے۔ ہماری نصف صدی پر محیط ناعاقبت اندیشی اور نانجاریوں نے اسے اس رشکِ ثریا مقامِ بلند سے پستی کی پاتال میں لا پٹکا ہے جس کے لئے یہ عالمِ وجود میں آیا تھا۔ اس قوم کی، اور اس کے قائدین کی آپا دھاپی نے پاکستان کے ہاتھ میں کاسۂ گدائی تھما دیا جبکہ ملت کے مقدر کے کتنے ہی ستاروں کے لئے اپنی دولت کا شمار بھی آسان کام نہیں۔ اہلِ سیاست نے اپنی سیاست گردی کے اعمالِ بد کی شامت کو وطن کے سر مڑھ دیا' اسے عزت و وقار کے مقام سے محروم اور پوری دنیا میں یکہ و تنہا کر کے چھوڑ دیا ہے۔ اس پاک سرزمین کا پانی فروخت کیا جا چکا اور زرخیز مٹی میں ولایتی کیمیائی زہر کی آمیزش کر دی گئی ہے۔ ملکِ خداداد کا آسمان اپنا رہا نہ زمین اپنی' وسائل و ذرائع سمیت سب کچھ صیہونی مہاجنوں کے پاس گروی رکھا جا چکا ہے۔ قوم اپنے بارے میں کوئی چھوٹے سے چھوٹا فیصلہ کرنے میں بھی آزاد نہیں رہی' اوپر سے آنے والے فرامین کی تعمیل پر مجبور ہے۔ کردار سازی اور تہذیبِ اخلاق کا کام تو یہاں شروع ہی نہیں ہوا' فحاشی و عریانی کے سیلاب کے سامنے سے ہر رکاوٹ ہٹائی جا رہی ہے تاکہ اعلیٰ و ارفع قدروں کو بنیاد تک سے کھود کر پھینکا جا سکے۔ لوگو! پاکستان کو اب وہ اسلامی ملک ہونے کا منفرد اعزاز بھی حاصل ہو گیا ہے جس میں رجالِ دین کے گرد تو گھیرا تنگ کیا جا رہا ہے اور عالمی شناخت رکھنے والی تحریکِ اسلامی کے قائد سینٹ کی رکنیت کو ہی اپنی تمناؤں کا حاصل سمجھتے اور محض "سینیٹر" کہلانا پسند فرماتے ہیں!۔

اسلامی جمہوریۂ پاکستان کو جس نے قراردادِ مقاصد کا کلمۂ شہادت پڑھ کر باقاعدہ اسلام قبول کیا تھا' کس نے اس حال کو پہنچایا؟۔ ہمارے سیاستدانوں نے!' مذہبی و دینی قیادت نے!' اہلِ علم و دانش نے!' کوچۂ صحافت کے شہسواروں نے! یا دنیا و عاقبت دونوں کو خرید ایچا کی میزان پر تولنے والوں نے!۔ ہاں سب نے مل کر یہ لنکا ڈھائی ہے۔ ہم میں سے ہر شخص اس جرم میں کم و بیش ملوث ہے اور سب کو نہیں تو اب آبادی کے ایک معتدبہ حصے کو تلافیٔ مافات کا عزم کرنا ہو گا جس کے لئے دعاؤں سے مدد لینے کا موسم آ گیا ہے۔ یہ دعائیں شرفِ قبولیت بھی ضرور پائیں گی کہ اللہ کا وعدہ ہے' صرف ایک شرط سے مشروط! تم اللہ کی سنو اور مانو' اللہ کریم تمہاری سنے اور مانے گا۔○○

قیمت: ۶ روپے

رمضان المبارک کی مناسبت سے متعلقہ آیات قرآنی دوبار "ندا" اور "ندائے خلافت" میں شائع ہو چکی ہیں۔ سورۃ البقرہ کی وہ آیات مبارکہ قارئین کرام کو خود یاد ہوں گی۔ اس بار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک خطبہ کا مطالعہ فرمائیے جو آپؐ نے رمضان المبارک کی آمد کے موقع پر صحابہ کرامؓ کو دیا تھا۔

جوامع الکلم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ٗ سے روایت ہے کہ ماہِ شعبان کی آخری تاریخ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ایک خطبہ دیا۔ اس میں آپؐ نے فرمایا :

"اے لوگو! تم پر ایک عظمت اور برکت والا مہینہ سایہ فگن ہو رہا ہے۔ اس مبارک مہینہ کی ایک رات (شب قدر) ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اس مہینے کے روزے اللہ تعالیٰ نے فرض کئے ہیں اور اس کی راتوں میں بارگاہ خداوندی میں کھڑا ہونے (یعنی نماز تراویح پڑھنے) کو نفل عبادت مقرر کیا ہے (جس کا بہت بڑا ثواب رکھا ہے) جو شخص اس مہینے میں اللہ کی رضا اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لئے کوئی غیر فرض عبادت (یعنی سنت یا نفل) ادا کرے گا تو اس کو دوسرے زمانہ کے فرضوں کے برابر اس کا ثواب ملے گا اور اس مہینہ میں فرض ادا کرنے کا ثواب دوسرے زمانہ کے ستر فرضوں کے برابر ملے گا۔ یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا بدلہ جنت ہے۔ یہ ہمدردی اور غم خواری کا مہینہ ہے اور یہی وہ مہینہ ہے جس میں مومن بندوں کے رزق میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ جس نے اس میں کسی روزہ دار کو (اللہ کی رضا اور ثواب حاصل کرنے کے لئے) افطار کرایا تو اس کے گناہوں کی مغفرت اور آتش دوزخ سے آزادی کا ذریعہ ہو گا اور اس کو روزہ دار کے برابر ثواب دیا جائے گا ٗ بغیر اس کے کہ روزہ دار کے ثواب میں کوئی کمی کی جائے۔ آپؐ سے عرض کیا گیا کہ : "یارسول اللہ! ہم میں سے ہر ایک کو تو افطار کرانے کا سامان حاصل نہیں ہوتا تو کیا غرباء اس ثواب سے محروم رہیں گے؟ آپؐ نے فرمایا کہ : اللہ تعالیٰ یہ ثواب اس شخص کو بھی دے گا جو دودھ کی تھوڑی سی لسی پر یا صرف پانی ہی کے ایک گھونٹ پر کسی روزہ دار کا روزہ افطار کرا دے۔ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے آگے فرمایا کہ) اور جو کوئی کسی روزہ دار کو پورا کھانا کھلا دے ٗ اس کو اللہ تعالیٰ میرے حوض (حوض کوثر) سے ایسا سیراب کرے گا جس کے بعد اس کو کبھی پیاس ہی نہیں لگے گی تا آنکہ وہ جنت میں پہنچ جائے گا۔ (اس کے بعد آپؐ نے فرمایا) اس ماہ مبارک کا ابتدائی حصہ رحمت ہے اور درمیانی حصہ مغفرت ہے۔ اور آخری حصہ آتش دوزخ سے آزادی ہے۔ (اس کے بعد آپؐ نے فرمایا) اور جو آدمی اس مہینے میں اپنے غلام و خادم کے کام میں تخفیف کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمائے گا اور اس کو دوزخ سے رہائی اور آزادی دے دے گا۔" (رواہ البیہقی۔ فی شعب الایمان)

(ترجمہ ماخوذ از معارف الحدیث ٗ مولانا محمد منظور نعمانی)

تاخلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

تحریکِ خلافت پاکستان کا نقیب

ہفت روزہ
ندائے خلافت
لاہور

جلد ۴ شمارہ

۷ / فروری ۱۹۹۵ء

مدیر
اقتدار احمد

معاونین : حافظ عاکف سعید
نثار احمد ملک

یکے از مطبوعات

تحریکِ خلافت پاکستان
۴ اے مزنگ روڈ۔ لاہور

مقام اشاعت
۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور
فون: ۸۵۶۰۰۳

پبلشر: اقتدار احمد طابع: رشید احمد چودھری
مطبع مکتبہ جدید پریس ریلوے روڈ لاہور

قیمت فی پرچہ: -/۶ روپے
سالانہ زر تعاون (اندرون پاکستان) -/۱۲۵ روپے

زر تعاون برائے بیرون پاکستان

سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، بھارت	۱۳ امریکی ڈالر
مسقط، عمان، بنگلہ دیش	۱۰ 〃 〃
افریقہ، ایشیا، یورپ	۱۶ 〃 〃
شمالی امریکہ، آسٹریلیا	۲۰ 〃 〃

اداریہ

بجا کہتے ہو' سچ کہتے ہو' پھر کہیؤ کہ ہاں کیوں ہو!

۲۸ / جنوری کو لاہور کے قریب ایک نجی تھرمل پاور سٹیشن کی افتتاحی تقریب میں وزیرِ اعظمٰی بے نظیر بھٹو صاحبہ نے سیاست کے باب میں جو ایک اصول بیان فرمایا اس پر "تری آواز مکے اور مدینے" کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ ان کی بات کے مفہوم میں کوئی تبدیلی کئے بغیر اگر بالفاظ دیگر دہرایا جائے تو یوں ہو گی کہ جسے سیاست کرنی ہو' وہ خود تجارت کیوں کرے اور خود کارخانہ دار کیوں ہو! --- اور ہم عرض کریں گے کہ "بجا کہتے ہو' سچ کہتے ہو' پھر کہیؤ کہ ہاں کیوں ہو!" لیکن بی بی آپ نے آدھا سچ بیان کیا۔ پورا سچ یہ ہے کہ سیاست دان کے پاس جاگیر بھی نہیں ہونی چاہئے' ہزاروں ایکڑ پر مشتمل شکار گاہیں بھی نہیں' گھوڑی پال قسم کے درجنوں مربعے بھی نہیں اور اتنی بڑی غیر حاضر زمینداری بھی نہیں کہ تجمل حسین خاں کو سوائے عیش کے کوئی کام نہ رہے۔ خود آپ کے والد جاگیردار نہ ہوتے اور جاگیردارانہ ذہنیت کے خول سے باہر نکل سکتے تو ایک سچے اور کھرے سیاست دان ہوتے اور اس ملک کی سیاست کو کسی اچھی ڈگر پر ڈال کر جاتے۔ پھر "کرخنداری" سے آپ کی اپنی توبہ بھی نئی نویلی ہے ورنہ ۱۹۸۸ء میں آپ کے وزارت عظمٰی کے منصب جلیلہ پر فائز ہونے کے بعد آپ کے شوہر نامدار نے پہلا کام یہ کیا تھا کہ اپنی شوگر مل (یا ملوں) کی داغ بیل ڈالی حالانکہ صنعت و حرفت سے ان کا دور پار کا بھی علاقہ نہ تھا۔ خیر' صبح کا بھولا شام کو گھر آ جائے (اگر آ گیا ہو) تو اسے بھولا نہیں کہتے۔

سیاست ہمارے ملک میں رسوا ہو کر گالی بن گئی ورنہ اس سے بڑھ کر معزز و موقر کام کونسا ہو سکتا ہے جو دراصل قوم کو دین و دنیا کی فلاح کا راستہ دکھانے کا کام ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک حکیمانہ قول میں مذکور تصریح کے مطابق سابقہ امت مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کی سیاست ان کے انبیاء کے ہاتھوں میں تھی۔ خود برصغیر میں تحریک آزادی کی آبیاری کرنے والے مسلمان سیاست دانوں میں سے کس کے کارخانے نے سال کے سال نئے کارخانے کی شکل میں بچہ دیا تھا جو ان دنوں جڑواں بچے دینے لگے ہیں؟۔ کون ملک التجار تھا؟۔ ہمارے چمن سیاست کے گلِ سرسبد حضرت قائداعظم علیہ رحمت نے ایک سکہ بند کاروباری گھرانے کا فرد ہونے کے باوجود انڈسٹری نہیں لگائی' انگریز حاکموں سے امپورٹ ایکسپورٹ کے لائسنس نہیں مانگے بلکہ قانون کا پیشہ اختیار کیا جس کا ان دنوں سیاست سے چولی دامن کا ساتھ تھا اور اب بھی وہ ایک دوسرے سے بے نیاز نہیں رہ سکتے کہ قانون کی عمل داری پر نگرانی اور قانون سازی سیاست کا حصہ ہی تو ہے۔ اسی سے انہوں نے اپنے لئے باعزت معاش کا انتظام کیا اور اسی کی مدد سے جنگ آزادی لڑ کر بتوفیق الٰہی ہمیں پاکستان کی شکل میں ایک گوشہ عافیت لے کر دیا تھا۔ افسوس کہ وہ چلن قائداعظم کی وراثت کے دعویداروں نے بھی نہ اپنایا اور ستم ظریفی کی انتہا تو یہ ہے کہ آج جو صاحب اپنے آپ کو قائداعظم کی اصلی مسلم لیگ کا صدر الصدور سمجھتے اور بزعم خویش قائداعظم ثانی ہیں' انہوں نے تو اگلے پچھلے سب ریکارڈ توڑ کر رکھ دیئے۔ ان کی سیاست کی مرغی نے بالی عمریا سے ہی جو سونے کے انڈے دینے شروع کئے' ان کا کوئی حساب ہے!۔ کارخانے میں کارخانہ!' کارخانے سے کارخانہ!' کارخانے پر کارخانہ!

ایک نئی لعنت جو ہم پر مسلط ہوتی جا رہی ہے' جمہوری معاشروں کے لئے ایک بالکل نئی لیکن بڑی ہی مہلک چھوت ہے۔ گزشتہ دو عشروں میں اکثر جاگیردار اور بڑے زمیندار بیک وقت صنعت و تجارت میں آ گھسے اور بہت سے صنعت کاروں تاجروں نے اپنی قوت خرید کے بھرپور استعمال کے ذریعے زرعی اراضی حاصل کر کے بڑے بڑے فارم بنا لئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ جاگیرداروں نے تو اپنی نااہلی اور کام چوری کے باعث صنعت و تجارت کا بھی ستیاناس ہی کیا جبکہ صنعت کاروں اور تاجروں نے اپنے تجربے کے بل پر زراعت سے بھی خوب دام کھرے کئے ہیں لیکن دونوں ہی طبقات نے آخرکار سیاست کے میدان کو اپنی جولان گاہ کے طور پر منتخب کیا ہے تو اس لئے کہ جاگیرداروں کو صنعت و تجارت میں ڈبوئے ہوئے کروڑوں اربوں کے قرضے معاف کرانے تھے اور

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

نثار احمد ملک

اے گرفتار ابو بکرؓ و علیؓ ہشیار باش!!

مذہبی رواداری کی آڑ میں سیکولرزم لانے کی ناپاک سازشیں

فرقہ واریت اس ملک کے لئے کم اور احیائے اسلام کے لئے زیادہ مہلک ہے

اس ملک کا قبلہ تبدیل کرنا کیا سیاست دانوں کا مشترکہ خواب نہیں؟

وطن عزیز اس وقت بتیس دانتوں میں زبان کی طرح بے شمار مسائل میں گھرا ہوا نظر آتا ہے۔ ان گوناگوں مسائل میں سے جس پر بھی غور کیا جائے' وہی سب سے گمبھیر اور خطرناک نتائج کا حامل دکھائی دیتا ہے۔ ان بہت سے مسائل میں سے ایک فرقہ واریت کا عفریت بھی ہے' جو ملت اسلامیہ پاکستان کے اتحاد و یک جہتی کو نگل لینے والا ہے۔ اس مسئلے نے اس قدر خوفناک صورت اختیار کرلی ہے کہ پاکستان کے ہر باشعور شہری کو سوچنے پر مجبور ہونا پڑ گیا۔

اس مسئلے کے محرکات و اسباب کیا ہیں' اس کے نتائج و عواقب کس قدر دور رس ہوں گے' اس مسئلے کا تاریخی پس منظر کیا ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ اس مسئلے کو حل کیسے کیا جائے' یہ وہ سوالات ہیں جو اپنا جواب اور حل مانگتے ہیں۔ اب ان سوالات کا ایک جواب نظری و فکری سطح پہ ہو سکتا ہے' جو چنداں مشکل نہیں ہے لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس مسئلے کا کوئی قابل عمل حل تلاش کیا جائے اور اس کی طرف عملی پیش رفت بھی ہو۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ شیعہ اور سنی مکاتب فکر صدیوں سے اکٹھے رہ رہے ہیں۔ ان دو مکاتب فکر کے درمیان اختلافات بھی رنگ تو بدلتے رہے لیکن نئے نہیں ہیں بلکہ بہت ہی پرانے ہیں۔ پھر یہ بھی ہوا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان اختلافات میں شدت کا عنصر داخل ہوتا رہا ہے۔ ان علمی اختلافات کے باوجود یہ دونوں مکاتب فکر کسی قدر امن و آشتی کے ساتھ رہتے رہے ہیں۔ جہاں تک علمی سطح پر ایک دوسرے کے نظریات کے توڑ کا تعلق ہے تو یہ کام ہر دو اطراف سے تحریری صورت میں بھی ہوتا رہا ہے اور مناظرہ و مجادلہ کا بازار بھی گرم رہا لیکن اس سب کے باوجود گزشتہ ایک دو سو برسوں کے دوران پورے ہندوستان میں خصوصاً اور عالم اسلام میں عموماً' مسلح تصادم کے اکا دکا واقعات ہی ہوا کرتے تھے' جیسے لکھنؤ وغیرہ میں' لیکن بحیثیت مجموعی امن و امان کی فضا قائم رہی ہے۔

اب اس موقع پر ایک سوال ابھرتا ہے کہ اچانک حالات اس قدر خراب کیوں ہو گئے اور رواداری و قوت برداشت یکسر ناپید کیوں ہو گئے۔ اس صورت حال کا ذمہ دار کسی ایک فریق کو نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ تاہم یہ بات اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ اہل سنت والجماعت کے تمام مکاتب فکر امت کے تمام اکابرین بشمول ائمہ اہل بیت کی تکریم کو اپنا جزو ایمان سمجھتے ہیں۔ رہا معاملہ افضلیت و مفضولیت کا تو اس میں اختلاف ہو سکتا ہے جو مستلزم لکفر بھی نہیں ہے!! اس کے بالکل برعکس اہل تشیع حضرات میں سے امامیہ مکتب فکر' جسے اثنا عشری کہا جاتا ہے' اصحاب ثلاثہ اور بعض دوسرے اصحاب رسولؐ کو' جنہیں اہل سنت کے تمام مکاتب فکر محترم و مکرم جانتے ہیں' طعن و تشنیع کا نشانہ بناتے رہے ہیں۔ اس میں یہ فرق تو ضرور ہوتا ہے کہ جو اہل تشیع کے کم پڑھے لکھے "ذاکرین" ہیں وہ زیادہ عریاں انداز میں' اپنی مجالس میں طعن و تشنیع کے تیر برساتے ہیں جبکہ پڑھے لکھے حضرات' جو طبقہ علماء سے تعلق رکھتے ہیں' وہ علمی نکتہ طرازیوں کے ذریعے اور نسبتاً ڈھکے چھپے الفاظ میں یہی کام کرتے ہیں۔ لہٰذا اہل تشیع کی طرف سے اس "تبرائی" مہم نے اہل سنت کے صبر کے پیمانے کو لبریز کر دیا۔ اہل تشیع کی طرف سے اس مہم کا آغاز ایرانی انقلاب کے بعد زیادہ زور و شور سے ہوا۔

آج دونوں طرف سے محاذ آرائی پورے عروج پر پہنچ چکی ہے جو ملت اسلامیہ پاکستان کے جسد کو پارہ پارہ کر دینے کے لئے تیار ہے۔ ایک دوسرے کے علماء کا قتل کیا جا رہا ہے۔ ہماری دانست اور یادداشت کے مطابق مبینہ طور پر علماء کی سطح پر پہلا مذہبی قتل ۱۹۸۲ء میں مولانا حکیم فیض عالم صدیقی" کا تھا' جنہیں جہلم شہر میں' ان کی مسجد میں قتل کر دیا گیا۔ اس کے کافی عرصہ بعد علامہ عارف حسینی کو قتل کیا گیا' جو مبینہ طور پر سیاسی قتل تھا نہ کہ مذہبی' اگرچہ مذہبی عنصر کو بھی ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ علامہ حسینی کے قتل کے بعد سے یہ سلسلہ مسلسل جاری ہے' جو رکنے کا نام نہیں لیتا۔

دراصل معاملہ اس وقت اپنے بگاڑ کی انتہا کو پہنچ گیا جب مقدس ہستیوں کے نام پر فرقہ وارانہ گروہ تشکیل پا گئے۔ ایک طرف "سپاہ صحابہؓ" ہے اور دوسری طرف "سپاہ محمدؐ"۔ گویا فرقہ وارانہ سرگرمیاں بہت ہی منظم انداز میں جاری ہیں۔ یہ مذہبی گروہ دونوں طرف کے عوام کے مذہبی جذبات کا استحصال کر رہے ہیں۔

مذہبی منافرت کے ان ظاہری اسباب کے علاوہ' کہا جاتا ہے کہ دشمن ملک کی خفیہ ایجنسیاں بھی اس آگ کو بھڑکا رہی ہیں۔ دونوں طرف سے ہونے والے قتل و غارت کا ذمہ دار "را" کو ٹھہرایا جا رہا ہے۔ ہم دشمن کی طرف سے کئے گئے کسی بھی تخریبی کام کی توقع رکھتے ہیں اور اس کی نفی نہیں کرتے۔ اس بات کا غالب امکان موجود ہے کہ قتل کی وارداتوں میں "را" کا ہاتھ ہو۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "را" کو یہ موقعہ بھی تو کیا ہم نے ہی فراہم نہیں کیا؟ ہمارے باہمی اختلافات رواداری اور اعتدال کی حدود سے متجاوز ہوئے ہیں' تب ہی اس کو اپنا کام دکھانے کا موقع ملا ہے۔

بھارتی خفیہ ایجنسی "را" کے ملوث ہونے کا امکان تو ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ پنجاب کے گورنر چودھری الطاف حسین نے واضح طور پر قتل کی ان وارداتوں کا ذمہ دار سپاہ صحابہؓ اور سپاہ محمدؐ کو ٹھہرایا ہے۔ چنانچہ ۱۵ جنوری کے روز نامہ "پاکستان" میں ان کا بیان چھپا ہے' جس میں انہوں نے کہا کہ حکومت نے فرقہ پرست جماعتوں کو سختی سے ختم کر دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ "آج کے

بعد کسی بھی صوبے میں مسلک یا مذہب کی بنیاد پر خون خرابے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ کسی کو قتل عام اور لاقانونیت کی اجازت نہیں دی جا سکتی.... اور سختی سے ہر قاتل کی کلائی موڑ دی جائے گی۔ آج کے بعد فرقہ واریت کے خاتمے کی راہ میں کوئی مصلحت آڑے نہیں آئے گی۔ نہ مخلوط حکومت کی کوئی جماعت اور نہ ہی کوئی فرد اس کی راہ میں حائل ہو گا۔ گزشتہ روز گورنر ہاؤس میں اخبار نویسوں سے گفتگو کرتے ہوئے گورنر پنجاب نے کہا کہ فرقہ پرست تنظیمیں دو برائیاں ہیں' جن پر پابندی لگانے سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا' اس لئے کہ ایک نام پر پابندی لگانے سے وہ دوسرے نام پر آ جائیں گی.... گزشتہ ڈیڑھ دو ماہ میں پنجاب میں سپاہ صحابہؓ نے ۱۹ شیعہ افراد کا قتل کیا جس میں آٹھ وہ لوگ بھی شامل ہیں جو لاہور میں شوکت اسلام کانفرنس میں شرکت کر کے واپس جا رہے تھے.... اس طرح سپاہ محمدؐ میں خود کو جرنیل کہلانے والا رضا نقوی مولانا اعظم طارق پر قاتلانہ حملہ میں نامزد ہے اور مولانا اعظم طارق کے مطابق وہ اس حملہ میں خود بھی زخمی ہو گیا تھا لیکن پولیس نے اسے گرفتار نہ کیا۔ دونوں طرف سے جو الزامات لگ رہے ہیں اور جو تحقیقات سامنے آ رہی ہیں ان کی حقیقت تو عدالتوں میں ثابت ہو گی لیکن جو مواد پولیس نے اکٹھا کیا اس کے مطابق ۱۸' ۱۹ افراد شیعوں کے چند ماہ میں قتل ہوئے اور اسی طرح سپاہ صحابہؓ کے مرنے والے بھی کافی تعداد میں ہیں۔ تحقیقات جاری ہیں اور جلد ہی صورتحال مزید واضح ہو جائے گی۔ یہ قاتل بے نقاب ہوں گے اور یقینی طور پر عوام کے سامنے کھڑے کئے جائیں گے"۔

یہ تو گورنر پنجاب کا بیان تھا' جس میں انہوں نے فریقین پر الزام لگایا کہ وہ فرقہ وارانہ دہشت گردی میں ملوث ہیں۔ ہم گورنر پنجاب کے بیان پر یقین نہ کرتے لیکن ایک اخباری بیان میں خود اعظم طارق صاحب نے تسلیم کیا ہے کہ دونوں طرف سے ہونے والی قتل کی وارداتوں میں سپاہ صحابہؓ اور سپاہ محمدؐ ملوث ہیں۔ اس طرح کے بیانات سے اس بات میں وزن نہیں رہتا کہ اس قتل و غارت میں "را" کا ہاتھ ہے۔ مولانا اعظم طارق صاحب نے ایک بیان میں کہا ہے کہ "را" کے ایجنٹوں کو صرف سپاہ صحابہؓ کی مساجد ہی نظر آتی ہیں۔ خیر یہ بات تو الگ ہے کہ کیا واقعی انہیں سپاہ صحابہؓ کی مساجد نظر آتی ہیں یا نہیں' لیکن یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ فریقین ایک دوسرے کو ہی مورد الزام ٹھہرا رہے ہیں۔

حکومت پنجاب کے حالیہ اقدامات اور گورنر صاحب کے تلخ و ترش بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکومت پنجاب نے فرقہ واریت کو آہنی ہاتھوں سے دبانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس فیصلے میں اسے صدر پاکستان سمیت مرکزی حکومت کی بھی تائید حاصل ہے' یا اشارہ ملا ہوا ہے۔ لیکن حکومت پنجاب کے اقدامات اور گورنر صاحب کے بیانات کے خلاف مبینہ فرقہ پرست گروہوں کا رد عمل بھی بہت ہی شدت کے ساتھ سامنے آیا ہے۔ دونوں گروہ حکومت پنجاب کے اقدامات کو جانبدارانہ قرار دے رہے ہیں۔ دوسری طرف حکومت پنجاب نے سپاہ صحابہؓ کے مرکزی رہنماؤں سمیت ۱۵ علماء کو اشتہاری ملزم قرار دے دیا ہے جبکہ سپاہ محمدؐ کے مرکزی رہنما مرید عباس یزدانی کو پریس کلب راولپنڈی کے آڈیٹوریم سے گرفتار کر لیا گیا۔ ان کی اس گرفتاری کے خلاف لاہور میں سپاہ محمدؐ نے دو بڑے جلوس نکالے ہیں' جن میں سے ایک جلوس میں حکومت پنجاب کو الٹی میٹم بھی دیا گیا ہے۔ اسی طرح گیارہ جنوری کو سپاہ صحابہؓ نے مولانا ضیاء الرحمن فاروقی صاحب کی قیادت میں مساجد میں فائرنگ کے خلاف شاہراہ قائد اعظم پر زبردست احتجاجی مظاہرہ کیا اور حکومت کو ۱۹ جنوری تک ان کے گروہ کے مقتولین کے قاتلوں کو گرفتار کرنے کا الٹی میٹم دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کے بعد ہم راست اقدام پر مجبور ہو جائیں گے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہر دو فریق کے پاس بے حساب اسلحہ موجود ہے۔ سپاہ محمدؐ نے لاہور میں منعقد ہونے والی کانفرنسوں میں اس اسلحہ کی نمائش بھی کی اور سپاہ صحابہؓ کے رہنماؤں کے بیانات بھی آتے رہے ہیں کہ اتنا اسلحہ تو ہمارے ایک یونٹ کے پاس ہے!! اس وقت سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر یہ آگ اسی طرح بھڑکتی رہی تو وہ وقت دور نہیں جب یہ سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے کر بھسم کر دے۔ اس خدشے کا اظہار تحریک جعفریہ کے مرکزی رہنما علامہ ساجد نقوی نے ایک ہفت روزے کو انٹرویو دیتے ہوئے بھی کیا ہے کہ اگر اس آگ پر قابو نہ پایا گیا تو لوگ کراچی کو بھول جائیں گے۔ سپاہ محمدؐ کے رہنماؤں کے بیانات آئے دن اسی نوعیت کے ہوتے ہیں کہ پنجاب کو کراچی بنا دیں گے۔

ابھی وقت ہے کہ اس آگ پر قابو پا لیا جائے۔ اس کے دو طریقے ہو سکتے ہیں۔ پہلا طریقہ تو قانونی ہے۔ حکومت پنجاب نے یہ طریقہ اختیار کر رکھا ہے۔ اگر یہی طریقہ اپنانا ہے تو فریقین پر غیر جانبدارانہ انداز میں ہاتھ ڈالنا چاہئے۔ جبکہ دوسرا طریقہ مذاکرات اور افہام و تفہیم کا ہے۔ اس طریقے کو حکومت کے علاوہ دونوں مکاتب فکر کے ان علماء کو اختیار کرنا چاہئے جو معتدل مزاج کے حامل ہیں' جو اس ملک میں امن و امان کی فضا کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ حضرات اپنے اپنے گروہوں کے رہنماؤں کو سمجھائیں۔ قانونی سطح پر یہ بات اب بہت ہی ضروری ہو گئی ہے کہ ہر مکتبہ فکر کی محترم شخصیات کی ناموس کی حفاظت کی جائے اور جو اس قانون کی خلاف ورزی کرے' اس کے لئے عبرت ناک سزا تجویز کی جائے۔ جب تک ہم ایک دوسرے کے جذبات کا احترام نہیں کریں گے' اس وقت تک امن کا قیام ایک وہمہ سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

اس دوسرے طریقے پر کام کا آغاز اسلامی نظریاتی کونسل کے تحت بننے والی فرقہ واریت کے خاتمہ کی کمیٹی نے بھی شروع کر دیا ہے۔ اس کمیٹی کے ارکان نے سپاہ صحابہ سمیت مختلف مذہبی جماعتوں کے مرکزی رہنماؤں سے مذاکرات کا ایک راؤنڈ مکمل کر لیا ہے۔ سپاہ صحابہؓ نے فرقہ واریت کے خاتمہ کے لئے سات تجاویز پیش کی ہیں' جن کو بنیاد بنا کر بات کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے وفد سے ملاقات کے بعد مولانا اعظم طارق نے ایک پریس کانفرنس میں ان تجاویز کا اعادہ کیا' جو اسلامی نظریاتی کونسل کے وفد کو پیش کی گئی ہیں۔ ان تجاویز میں پہلی یہ ہے کہ سپاہ صحابہؓ اور تحریک جعفریہ اور ان کی حامی تنظیمیں ان شخصیات کے نام دیں' جنہیں وہ مقدس سمجھتی ہیں اور ان شخصیات کی شان میں گستاخی کرنے والے کے لئے سزا تجویز کریں اور حکومت سزا مقرر کرنے کے لئے قانون سازی کرے۔ ان کی دوسری تجویز یہ ہے کہ عبادت کو عبادت گاہوں تک محدود کر دیا جائے۔ تیسری یہ کہ قتل اور حملوں کے مختلف واقعات میں ملوث طرفین اپنی لیڈر شپ اور نامزد افراد کو رضاکارانہ طور پر تفتیش کے لئے پیش کر دیں۔ ان میں سے کوئی بے گناہ ہو تو واپس آ جائے' گنہگار ہو تو سزا پائے۔ چوتھی یہ کہ شیعہ حضرات سے بھی حکومت زکوٰۃ لے اور اگر زکوٰۃ دینے کی بجائے فیس دینا چاہتے ہیں تو وہ دیں اور اس وقت تک انہیں زکوٰۃ کمیٹیوں کا چیئرمین یا رکن نہ بنایا جائے۔ پانچویں یہ کہ طالب علموں کے لئے اسلامیات کا یکساں نصاب رائج کیا جائے۔ چھٹی یہ کہ عبادت گاہوں میں اسلحہ کی موجودگی کے الزام پر پولیس عبادت گاہوں کی تلاشی لینا چاہے تو مزاحمت نہ کی جائے۔ سپاہ صحابہ کی طرف سے ساتویں تجویز یہ ہے کہ سپاہ صحابہؓ اور تحریک جعفریہ جب سے بنی ہیں' اس وقت سے اب تک انہیں کہاں کہاں سے امداد آئی اور کہاں خرچ ہوئی' باہر کے ممالک سے ان تنظیموں نے کن افراد کو بلایا' وہ کہاں ٹھہرے اور کیا کرتے رہے' اس کی تحقیق کی جائے اور حقائق عوام کے سامنے لائے جائیں۔ جب تک یہ حقائق سامنے نہیں آ جاتے کسی بیرونی شخصیت کو کوئی تنظیم مدعو نہ کرے۔

اس پریس کانفرنس میں مولانا اعظم طارق صاحب نے کہا کہ اگر حکومت امن و امان کی خاطر برابری کی بنیاد پر جائز قانونی ضابطہ اخلاق لائے تو سپاہ صحابہؓ اس ضابطہ اخلاق کی نہ صرف پابندی کرے گی بلکہ اس کے نفاذ میں حکومت کا بھرپور ساتھ دے گی۔ انہوں نے کہا تھا کہ اگر حکومت نے ہمیں مطمئن کئے بغیر سپاہ صحابہؓ پر پابندی لگائی تو ہم اس کی مزاحمت کریں گے۔ یک طرفہ پابندی سے بعد ازاں اٹھنے والا لاوا خطرناک ثابت ہو گا۔

بہرحال ہم اپنی تجویز کو پھر سے دہرائے دیتے ہیں کہ دونوں طرف کے معتدل مزاج کے حامل علماء کو اس ناسور کے خاتمے کے لئے اپنا کردار ادا کرنا ہو گا۔ اگر علماء کی

اکثریت نے فریق کا کردار ادا کرتے ہوئے اس معاملے کو تعصب و تنگ نظری کی نذر کر دیا تو وہ یاد رکھیں کہ جب یہ طوفان اٹھ کھڑا ہو گا تو نہ ان میں سے کسی کے مدارس اور عبادت گاہیں ہی محفوظ رہیں گی اور نہ مذہبی وضع قطع کا حامل کوئی فرد اپنے آپ کو اس طوفان سے الگ رکھ سکے گا۔ اس وقت گھن کے ساتھ گیہوں بھی پس جائے گا۔ یہ طوفان اتنا شدید ہو گا کہ لوگ واقعتاً کراچی کو بھول جائیں گے اور پورا پنجاب بیروت بن جائے گا۔ پھر یہ طوفان صرف پنجاب تک محدود نہیں رہے گا بلکہ دوسرے صوبے بھی اس کی لپیٹ میں آ جائیں گے۔ یہ بات ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ دونوں طرف اسلحہ کے انبار موجود ہیں۔ اس اسلحہ کی نمائش فریقین اپنے جلسوں میں بھی کر چکے ہیں اور اپنے بیانات سے اس کا اظہار بھی کر چکے ہیں۔

جیسا کہ مندرجہ بالا سطور میں عرض کیا گیا فرقہ واریت کا عفریت انتہائی خطرناک ہے۔ فرقہ وارانہ مذہبی تنظیموں کی حوصلہ افزائی کسی درجے میں بھی نہیں ہونی چاہئے۔ ان فرقہ وارانہ رجحانات کا ایک مظہر یہ سامنے آیا ہے کہ بعض دوسرے مکاتب فکر نے بھی سپاہ صحابہؓ اور سپاہ محمدؐ کی طرز پر تنظیم سازی شروع کر دی ہے۔ گویا انہوں نے بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے شروع کر دیئے ہیں۔ اگر اس رجحان پر بروقت قابو نہ پایا گیا تو یہ معاملہ سپاہ محمدؐ اور سپاہ صحابہؓ تک محدود نہیں رہے گا بلکہ دوسرے گروہ بھی اپنے فروعی اختلافات کی آڑ میں اپنے سے اختلافات رکھنے والے مذہبی گروہ کو نشانہ بنائیں گے۔

فرقہ واریت کے خاتمہ کے لئے حکومت کی طرف سے کئے گئے اقدامات کی ہم تائید کرتے ہیں' بشرطیکہ وہ فریقین کو اپنی غیر جانبداری کا یقین دلا دیں۔ دوسری بات یہ کہ حکومت ان اقدامات کو واقعتاً فرقہ وارانہ کارروائیوں میں ملوث گروہوں تک ہی محدود رکھے۔ اگر حکومت نے فرقہ واریت کی آڑ میں کچھ دوسرے مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کی تو ہم نہ صرف مذمت کریں گے بلکہ ڈٹ کر مخالفت بھی کریں گے۔ اس وقت قارئین کی توجہ اس عمل کے ایک بہت ہی اہم پہلو کی طرف مبذول کرانی مقصود ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ فرقہ واریت کا خاتمہ جتنا جلدی ممکن ہو سکے' ہونا چاہئے لیکن اس وقت ملک پر مسلط سیکولر ذہن کی حامل قیادت' فرقہ واریت کی آڑ میں مذہبی قوتوں کو بلا تفریق دیوار کے ساتھ لگانے پر تل گئی ہے۔ گویا حکومت کے عزائم میں محض فرقہ وارانہ رجحانات کی بیخ کنی ہی نہیں بلکہ "بنیاد پرستی" کا خاتمہ بھی شامل ہے۔ وہ اس ملک میں جاری دینی احیائی عمل کو روک دینا چاہتے ہیں۔ حکومت وقت اس ملک کو عریاں سیکولرزم کی طرف بہت تیزی سے لے جا رہی ہے لہٰذا اس راستے میں جتنی قوتیں بھی مزاحم ہیں' وہ ان کو ہٹا دینا چاہتی ہے۔

ظاہر ہے کہ حکومت کو یہ سب کچھ کرنے کا موقعہ رجال دین نے خود فراہم کیا ہے۔ ہمیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے تھا کہ اس ملک میں سانس لے رہے ہیں جہاں ہم اپنی بات ہر سطح پر بلا جھجک کہہ سکتے ہیں۔ اس آزادی سے ہمیں مثبت طور پر فائدہ اٹھانا چاہئے تھا اور لوگوں کی ذہن سازی کا کام کرنا چاہئے تھا۔ لیکن ہم نے اس آزادی کا غلط استعمال کر کے' دین دشمن قوتوں کو قانونی سطح پر اس آزادی کو چھین لینے کا جواز مہیا کیا ہے۔ بدقسمتی سے اس وقت وطن عزیز میں زمام کار بھی انہی دین دشمن قوتوں کے پاس ہے' جو چچا سام کے اشارے پر بنیاد پرستوں کو کچل دینے کا تہیہ کر چکی ہیں۔

اسلامی احیائی تحریکوں کے خلاف مزاحمت ملکی نہیں بلکہ بین الاقوامی سیاست کا حصہ ہے۔ اس وقت امریکہ سمیت پورا مغرب "بنیاد پرستی" کے نام سے بھی خائف ہے۔ لہٰذا ہر ملک میں دین حق کے سپاہیوں کے لئے حالات سازگار نہیں ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہماری دینی قیادت فہم و بصیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے امریکہ کے پٹھو حکمرانوں کے ان عزائم کو خاک میں ملا دے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے فرقہ وارانہ کشیدگی کی فضا کو ختم کیا جائے' جو حکمرانوں کے پاس دینی قوتوں کو کچلنے کا سب سے بڑا بہانہ ہے۔

حکومت نے فرقہ وارانہ کشیدگی کو کم کرنے کی آڑ میں مساجد میں لاؤڈ اسپیکر پر پابندی لگائی ہے۔ اس کا جواز بھی مذہبی جماعتوں نے ہی دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ مساجد میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال جس بے دردی سے کیا جاتا رہا ہے' اس کا نتیجہ یہی نکلنا تھا۔ لیکن حکومت کے اس اقدام سے ان جماعتوں کے دعوتی کام میں بہت بڑی رکاوٹ پیدا ہو گئی ہے جو خالص دینی' غیر سیاسی اور غیر فرقہ وارانہ بنیادوں پر کام کر رہی ہیں۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ کہیں کارنر میٹنگ یا جلسہ عام کرنا ہو تو پہلے حکومت سے اجازت لینا پڑتی ہے۔ اب یہ اجازت بھی کوئی شریفانہ انداز میں تھوڑی ہی ملتی ہے! یہ بات اب بیوروکریسی کے رحم و کرم پر ہے کہ وہ کسی کو اجازت دیں یا نہ دیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ آئے دن اس قانون کی خلاف ورزیاں ہو رہی ہیں۔ حکومت ائمہ و خطباء پر مقدمات پر مقدمات بنائے جا رہی ہے۔

حکومت کے اس اقدام پر ابھی تک کوئی تحریک نہیں چلائی گئی لیکن علماء کی طرف سے اس کی شدید مذمت کی گئی ہے۔ چنانچہ ۱۸ جنوری کے روزنامہ جنگ کے مطابق "جے یو پی نیازی گروپ کے قائم مقام صدر اور پنجاب اسمبلی کے رکن صاحبزادہ فضل کریم نے کہا ہے کہ حکومت نے یہودیوں کو خوش کرنے کے لئے مساجد میں لاؤڈ سپیکر پر بے جا پابندیاں عائد کر دی ہیں جبکہ ہم خود لاؤڈ سپیکر کے بے جا استعمال کے خلاف ہیں" اسی روز کے اخبارات میں بعض دوسرے علماء کے بھی اسی طرح کے بیانات شائع ہوئے ہیں۔

حکومت نے صرف لاؤڈ سپیکر پر پابندی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ وہ اس اقدام کے ذریعے مذہبی قوتوں کی نبض پر ہاتھ رکھنا چاہتی تھی۔ اب جبکہ اس نے اندازہ لگا لیا ہے کہ مذہبی قوتوں کا شیرازہ منتشر ہے لہٰذا انہیں دبانے کا یہ مناسب موقع ہے' اس نے دینی مدارس اور مساجد میں بھی مداخلت شروع کر دی ہے۔ دو جنوری کو روزنامہ جنگ لاہور میں وزیر داخلہ کا بیان چھپا ہے کہ "فرقہ واریت کے خاتمے کے لئے ملک بھر میں دینی مدارس کی رجسٹریشن کے بعد ان کے اکاؤنٹ آڈٹ کئے جائیں گے' دینی مدارس کو ریگولیٹ کرنے کے لئے بہت جلد ایک بل اسمبلی میں پیش کیا جائے گا"۔

اسی روز روزنامہ جنگ میں علماء کی طرف سے بھی ایک بیان چھپا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ "دینی مدرسوں کو اسلحہ کے ڈپو اور دہشت گردوں کے اڈے کہنے والوں کو نیست و نابود کر دیں گے۔ کٹ مریں گے مگر عطاء دین کی ناموس پر حرف نہیں آنے دیں گے۔ دین اسلام کی سربلندی کی راہ میں ہر رکاوٹ کو پاش پاش کر دیا جائے گا۔ دین کی تبلیغ کے لئے لاؤڈ اسپیکر استعمال کرنے پر گرفتار کیا گیا تو ملک گیر تحریک چلائی جائے گی اور علماء اجتماعی طور پر گرفتاریاں پیش کریں گے۔ مقررین نے اس عزم کا اظہار گذشتہ روز جامعہ حمیمیہ گڑھی شاہو میں تنظیم تحفظ مدارس و مساجد کے زیر اہتمام ملک گیر کنونشن میں کیا"۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ حکومت تدریجاً دینی قوتوں کا گھیرا تنگ کر رہی ہے۔ چنانچہ اسی سلسلے کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ کے حکم پر سرکاری مساجد میں خطیب عربی خطبے کے علاوہ اس موضوع پر تقریر کریں گے جس کے لئے انہیں کہا جائے گا۔ اسی خبر میں یہ بھی ہے کہ بے نظیر صاحبہ نے جہاد کے نام پر موجود تربیتی کیمپوں کو بند کرنے کا بھی حکم دیا ہے۔ یہ خبر روزنامہ خبریں نے ۱۷ جنوری کو لگائی ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اب یہ معاملہ محض سرکاری مساجد تک محدود نہیں رہے گا۔ کچھ دیر کی بات ہے کہ حکومت دوسری مساجد کے ائمہ کو بھی پابند کرنے کی کوشش کرے گی۔

حکومت کی دینی مدارس و مساجد میں مداخلت کا ایک مظہر ۲۱ جنوری کو سامنے آیا' جب ریاض بسرا نامی شخص کی تلاش میں پولیس نے جامعہ مدنیہ پر چھاپا مارا۔ روزنامہ نوائے وقت کی اشاعت ۲۲ جنوری کے مطابق پولیس نے مسجد و مدرسہ کی بے حرمتی کی ہے۔ پورے مدرسے میں جوتوں سمیت گھومتے رہے اور سوئے ہوئے طلباء کو بے دردی اور سفاکی سے ٹھوکریں اور رائفلوں کے بٹ مارے۔ جامعہ کی پوری عمارت کو پولیس نے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ اب لگتا ہے کہ اس طرح کی تلاشیاں' کبھی ملزموں کی تلاش کے نام پر اور کبھی اسلحہ کی تلاش کے نام پر تمام مدارس میں ہوں گی۔ دینی مدارس اور مساجد کے معاملات میں حکومت کی بڑھتی ہوئی مداخلت کا مظہر محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ کا وہ بیان ہے' جو ۲۳ جنوری

کے روزنامہ "خبریں" میں شائع ہوا ہے۔ اخبار لکھتا ہے کہ "فرقہ واریت کے خاتمہ کے لئے وزیر اعظم بے نظیر بھٹو صاحبہ کی سربراہی میں ہونے والے انتہائی اعلیٰ سطحی اجلاس میں فیصلہ کیا گیا ہے کہ فرقہ واریت کی تبلیغ کرنے اور ملٹری ٹریننگ دینے والے دینی مدرسوں کو بند کر دیا جائے۔ ان مدرسوں کو بند کرنے کے لئے وزیر قانون اور اٹارنی جنرل پر مشتمل ایک کمیٹی بنا دی گئی ہے جو موجودہ قانون کا جائزہ لے کر اس میں موجود سقم کو دور کرے گی یا پھر نیا مسودہ قانون تیار کیا جائے گا جس کے ذریعے ان مدرسوں پر پابندی عائد کی جا سکے۔ ذرائع کے مطابق وزیر اعظم نے کہا کہ کسی صورت میں بھی ملک میں فرقہ واریت پھیلانے کی اجازت نہیں دوں گی اور فرقہ واریت کی آڑ میں بھائی کو بھائی کا خون بہانے کا موقع نہیں دیا جائے گا۔ ذرائع کے مطابق وزیر اعظم نے اجلاس کے دوران ملک میں فرقہ واریت کو روکنے کے لئے قوانین کو سخت ترین بنانے کی ضرورت پر زور دیا"۔

اس بیان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ فرقہ واریت کے خاتمہ کی آڑ میں حکومت بلا تفریق تمام دینی قوتوں کو دیوار کے ساتھ لگا دینے میں کس قدر سرشاری اور عجلت کا شکار ہے۔ اسی خبر میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ مدارس میں بھی وہی نصاب پڑھایا جائے گا' جو دوسری یونیورسٹیوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ گویا آہستہ آہستہ ان مدارس کو قومیانے کی پالیسی پر عمل شروع ہو چکا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ پورے ملک کی ہر صنعت اور ہر ادارے کو پرائیویٹائز کیا جا رہا ہے اور عوام کے مالی انفاق سے بننے والے دینی مدارس کو قومیایا جا رہا ہے۔ وہ وقت دور نہیں جب دینی مدارس سے علماء کے عمل دخل کو ختم کر دیا جائے' الا یہ کہ علماء سروں پر کفن باندھ کر میدان میں اتر جائیں اور نہ صرف اس سیکولر حکومت سے نجات حاصل کر لیں بلکہ اس باطل نظام کو بھی بحیرۂ عرب میں ڈبو کر دم لیں جس کے موجودہ حکمران گماشتے بنے ہوئے ہیں۔ اس کے لئے انہیں کسی ایک قائد کی قیادت کو تسلیم کرنا ہو گا اور پوری طرح منصوبہ بندی کے ساتھ' ایک خاص طریق کار کو اختیار کرتے ہوئے' اسلامی انقلاب کی طرف بڑھنا ہو گا۔ اب اس نظام باطل سے جان چھڑائے بغیر علماء کے مدارس اور مساجد بھی نہیں چلیں گے لہٰذا چار و ناچار علماء کو مدارس و مساجد کی ٹھنڈی چھاؤں کو خیر آباد کہنا ہی ہو گا۔

ان واقعات کے علاوہ حکومتی کارندوں کے علماء کے بارے میں ریمارکس بھی بہت ہی ہتک آمیز ہوتے جا رہے ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں ہم مشتے از خروارے" پنجاب کے "لاٹ صاحب" کا بیان نقل کرتے ہیں' جو روزنامہ جنگ کی ۱۵ جنوری کی اشاعت میں تین کالمی سرخیوں کے ساتھ شائع ہوا۔ جناب گورنر صاحب فرماتے ہیں کہ "قاہرہ میں ہونے والی بہبود آبادی کانفرنس میں وزیر اعظم کی کوششوں کے نتیجے میں ان کے دیئے گئے متن کو منظور کیا گیا۔ وہ فیملی پلاننگ آف پاکستان کے زیر اہتمام قاہرہ کانفرنس کے بارے میں ایک سمپوزیم سے خطاب کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ مولوی حضرات نے آج تک کوئی کام کی بات نہیں کی' جس کی وجہ سے ان کے کاموں کو قابل ستائش کارنامہ قرار دیا جا سکے۔ انہوں نے کہا کہ تحریک پاکستان کے وقت بھی انہوں نے قائد اعظم کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں جو مخالفت کرتے رہے ہیں' قاہرہ کانفرنس نے انکی اس مخالفت کے اثرات کو زائل کر دیا"۔

اس وقت ہم اس بحث میں نہیں پڑتے کہ تحریک پاکستان میں کس کا کیا کردار تھا۔ انگریزوں کی جوتیاں چاٹ کر "سر" کا خطاب لینے والوں نے اپنے آقا کی خوشنودی کے حصول کے لئے کیا کردار ادا کیا اور علماء و مشائخ نے کس طرح "پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الہ الا اللہ" کے نعروں سے برصغیر کے شرق و غرب کو گرما دیا۔ یہ بات تفصیل طلب ہے کہ اگر علماء و مشائخ کی بہت بڑی اکثریت مسلم لیگ کا ساتھ نہ دیتی تو قیام پاکستان کا خواب شرمندہ تعبیر ہو بھی سکتا تھا یا نہیں! ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حکومتی کارندوں کا علماء کے بارے میں رویہ کیا سامنے آتا ہے۔ اس بیان سے بھی واضح ہوتا ہے کہ جناب گورنر صاحب مغربی قوتوں کے منصوبوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی فکر میں دبلے ہوئے جا رہے ہیں جبکہ اسلامی قوتوں کے خلاف ان کی زبان کس طرح زہر اگلتی دکھائی دیتی ہے۔

ایسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ تمام پابندیاں صرف دینی قوتوں کے خلاف بطور ہتھیار استعمال کی جا رہی ہیں' ورنہ حکومت کے بنائے گئے قوانین کی جس طرح "بسنت" کے منحوس تہوار پر دھجیاں اڑائی گئیں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ پورے دو دن اور دو راتیں اسلحے کی نمائش بھی ہوتی رہی' فائرنگ بھی ہوتی رہی اور میوزک بھی پورے جوبن پر رہا۔ اس وقت نہ حکومت کو اسلحے کی نمائش پر پابندی یاد آئی' نہ ہی لاؤڈ سپیکر پر پابندی کا ہی کچھ خیال رہا۔ حکومتی کارندے دیکھتے رہے اور ان کا بنایا ہوا قانون توڑا جاتا رہا۔ گویا ان "منچلوں" کے نزدیک اس قانون کی حیثیت کاغذ کے ایک پرزے سے زیادہ نہ تھی۔ دوسری طرف آئے روز علماء پر لاؤڈ اسپیکر کی پابندی کی خلاف ورزی پر مقدمات بنائے جا رہے ہیں۔

یہ بات بھی ڈرتے ڈرتے لکھی جا رہی ہے کہ کہیں توہین عدالت کا ارتکاب نہ ہو جائے کہ ہماری عدالت عالیہ نے "بسنت" کے تہوار کے حوالے سے یہ فیصلہ سنایا کہ اس تہوار کا تعلق زمین سے ہے' دین سے نہیں لہٰذا ہم شہریوں سے ان کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں نہیں چھین سکتے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ شہریوں کو خوشی کس بات کی ہے؟ کیا اس بات کی خوشی تھی کہ روس نے اسی روز چیچنیا پر قبضہ کر لیا ہے؟ کیا اس بات کی خوشی ہے کہ کشمیر میں خون مسلم سے ہولی کھیلی جا رہی ہے؟ کیا اس بات کی خوشی تھی کہ کراچی میدان جنگ بنا ہوا ہے؟ سوچنے کی بات ہے کہ امت مسلمہ اس وقت کس قدر مشکل حالات سے گزر رہی ہے لیکن ہمارے لچھن وہی ہیں' جو پہلے تھے۔

بہرحال ان تمام باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے' عرض یہ کرنا ہے کہ دینی قوتوں کو اپنی بقاء اور دین کی بہتری کے لئے کسی ایک نکتہ اتحاد کی طرف پیش رفت کرنی ہو گی۔ اس لئے کہ سیکولر قوتیں دوسرے نکات پر کتنی ہی مختلف فیہ کیوں نہ ہوں' اس نکتے پر متحد ہیں کہ اس ملک کا قبلہ تبدیل کر دیا جائے۔ دینی قوتوں کو باہم متحد ہو کر ان کے اس خواب کو چکنا چور کر دینا چاہئے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ فروعی اختلافات سے بالاتر ہو کر سوچا جائے۔ لہٰذا "اے گرفتار ابوبکرؓ و علیؓ ہوشیار باش" کہ "تیری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں"۔ اور اگر عقل کے ناخن نہ لئے تو "تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں"۔

بقیہ : بنگلہ دیشی محصورین

تشکیل کی ضرورت وہ کیوں محسوس نہیں کرتے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ نئے صوبوں کے قیام سے مقامی لوگوں کے اقتدار میں شرکت کو اسی طرح یقینی بنایا جا سکتا ہے۔ ہمیں تو اندیشہ ہے کہ اگر معاملات اسی طرح نمٹائے جاتے رہے جس طرح ذرائع ابلاغ ہمیں بتاتے ہیں تو کراچی صوبہ کیا کراچی فری پورٹ بھی بن سکتا ہے۔ اس لئے آج وہاں عوام کے ساتھ وہی سلوک ہو رہا ہے' جو آج سے ربع صدی قبل بنگالیوں کے ساتھ ہوا تھا۔ آج اگر پاکستان کی حکومت سندھیوں کی ناراضگی کی بنا پر ہمیں وہاں منتقل نہیں کرنا چاہتی تو خدانخواستہ کراچی یا سندھ پاکستان میں نہ رہا تو کیا ہو گا؟ کیا یہ حکومتیں اس صورت میں قائم رہ جائیں گی؟۔ رہا ہمارا مسئلہ تو ہماری وفاداری پہلے بھی پاکستان اور صرف پاکستان کے ساتھ رہی ہے۔ آج اس خرابی بسیار کے باوجود ہماری وفاداری اپنے پیارے پاکستان ہی کے ساتھ وابستہ ہے اور آئندہ بھی پاکستان کے ساتھ ہی وابستہ رہے گی۔ چاہے ہم پاکستان منتقل ہوں یا نہ ہوں۔ ہم اگر پاکستان منتقل ہو گئے تو ممکن ہے کہ کراچی کو صوبہ بنانے کے حامی ہو جائیں لیکن پاکستان کو فری پورٹ کبھی نہیں بننے دیں گے' چاہے اس کے لئے ایک بار پھر ہمیں کیمپوں میں منتقل ہو کر اپنی آنے والی نسلوں کی بربادی کا سامنا ہو۔" اس نے کہا۔ مجھے پاکستان سے آپ کی وفاداری کے بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں اور میں یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ پاکستانی عوام آپ کی منتقلی کی مخالف نہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہو۔ اللہ حافظ"۔ OO

☆ "پاکستان" کی خیالی ریاست' ایک دن حقیقت بن جائے گی

اخذ و ترجمہ : سردار اعوان

☆ قیامِ پاکستان کے بعد طاقت کا توازن تہہ و بالا ہو جائے گا

تحریکِ آزادیٔ ہند ----ایک انگریز مصنف کا تجزیہ

پچاس سال قبل (۱۹۴۴ء) میں شائع شدہ کتاب (Verdict on India) کے دو باب

ایشیا کے رجل عظیم' قائد اعظم سے مصنف کی یادگار ملاقات

مصنف Beverley Nichols کا کہنا ہے کہ یہ کتاب اس کے ایک سال پر محیط ہزاروں میل کے پیہم سفر پر مبنی مشاہدات کا نچوڑ ہے۔ مصنف نے پرزور وار انداز میں وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ------ اس میں کسی طرح کا برطانوی پروپیگنڈہ ----- یا سرکاری نقطۂ نظر شامل نہیں' نہ ہی اسے انڈیا آفس کی کسی قسم کی سرپرستی حاصل ہے بلکہ یہ تمام تر اس کی اپنی ذاتی مساعی کا حاصل ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ وضاحت اس لئے ضروری تھی کہ ہندوستان میں قدم رکھتے ہی ملکی پریس میں اس کے بارے میں طرح طرح کی چہ میگوئیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کسی نے مجھے برطانیہ کا نمائندہ قرار دیا' جسے یہاں خفیہ سفارت کاری اور سازباز کے لئے بھیجا گیا ہے۔ یہاں تک کہ ایک اخبار نے میرے وائسرائے مقرر کئے جانے کی خبر شائع کر دی' حالانکہ ان میں ذرہ برابر حقیقت نہ تھی۔ میں ایک آزاد مبصر کے طور پر یہاں مقیم رہا اور جو کچھ دیکھا اسے اپنی ذاتی حیثیت میں قلمبند کر دیا۔

اب ہم کتاب کے ایک نہایت اہم حصے کی طرف آتے ہیں' جو انتہائی فوری نوعیت کا مسئلہ بن چکا ہے۔ میرا مطلب پاکستان سے ہے۔ سلطنت پاکستان' مانا کہ ابھی یہ سلطنت صرف ایک خواب ہے مگر یہاں کے مسلمان کا ذہن اسے حقیقت سے کسی طرح کم تصور نہیں کرتا۔

پاکستان جس کے معنی "پاک سرزمین" ہیں۔ جغرافیائی اعتبار سے یہ ایک طرف ہندوستان کے شمال مغرب میں بلوچستان' سندھ' پنجاب اور شمال مغربی صوبے پر مشتمل خطہ زمین ہے اور دوسری طرف مشرق میں بنگال کا ایک بہت بڑا حصہ۔ تجویز یہ ہے کہ یہ علاقے جو مسلم اکثریت کے حامل ہیں' بقیہ ہندوستان سے جو ہندو اکثریت پر مشتمل ہے' ایک ہی دفعہ انہیں ہمیشہ کے لئے الگ کر دیا جائے اور وہ اپنے آپ کو ایک آزاد ریاست بنالیں۔ مسلم لیگ' جو ایک مربوط اور آزادی کی جنگ لڑنے کی صلاحیت سے بہرہ ور تنظیم ہے اور جسے ہندوستان کے پچاسی فیصد مسلمانوں کی قوت حاصل ہے' اس تجویز کی پرجوش حامی ہے جبکہ مسٹر ایم اے جناح اس کے مسلمہ قائد ہیں۔

آج کی یہ خیالی ریاست ایک دن حقیقت بن کر دنیا کے نقشے پر موجود ہو گی۔ میں ان لوگوں میں شامل ہوں جنہیں یہ یقین ہے کہ یہ ریاست قائم ہو کر رہے گی بلکہ اس کا قائم ہونا ناگزیر ہے اور جب یہ قائم ہو گی تو ایشیاء میں بالکل ایک نئی صورت حال پیدا ہو جائے گی جس سے موجودہ طاقت کا توازن تہ و بالا ہو کر رہ جائے گا اور دنیا کے تمام ممالک کو اپنی پالیسیاں نئے سرے سے ترتیب دینا پڑیں گی۔ چنانچہ ہمیں چاہئے کہ اس ریاست کا قدرے تفصیل سے جائزہ لیں۔ مگر پہلے آیئے یہ دیکھیں کہ اس کا پس منظر کیا ہے' یعنی مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان وہ طبقاتی کشمکش' جس کا حل پاکستان ہے۔ اس کتاب میں مختلف مقامات پر اس کے شواہد درج کر دیئے گئے ہیں مگر انہیں پاکستان کے حوالے سے اجاگر نہیں کیا گیا۔

بمبئی ایک ایسا شہر ہے جو ہندوستان کے اکثر بڑے شہروں کے مقابلے میں زیادہ پرسکون' پرامن اور مہذب شمار ہوتا ہے۔ یہاں کا پولیس کا نظام بہت اچھا ہے اور سڑکیں روشن ہیں۔ ایک عورت رات دن جہاں چاہے' بے خوف و خطر آ جا سکتی ہے۔ اور سب سے اہم یہ کہ طبقاتی کشمکش نہ ہونے کے برابر ہے۔ ایسے مواقع پر جب بیشتر دوسرے شہر ہندو مسلم فسادات کی زد میں ہوتے ہیں بمبئی میں لوگ خاموشی سے اپنا کام جاری رکھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود فروری ۱۹۲۹ء تا اپریل ۱۹۳۸ بمبئی کا جو ریکارڈ رہا وہ ملاحظہ فرمایئے۔

۱۹۲۹ء میں دو دفعہ فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ پہلے فساد میں جو ۳۶ روز جاری رہے ۴۹ افراد ہلاک اور ۳۹۷ شدید زخمی ہوئے۔ دوسرے میں ۳۵ افراد ہلاک اور ۱۰۹ زخمی ہوئے۔ یہ فسادات ۲۲ روز تک ہوتے رہے۔ ۱۹۳۰ء میں دو مرتبہ اس نوع کے ہنگامے ہوئے۔ اور ۱۹۳۲ء میں پھر دو مرتبہ۔ ان میں ہلاک اور زخمی ہونے والوں کی کم و بیش اتنی ہی تعداد تھی لیکن ۱۹۳۲ء میں دوسرے ہنگامے میں مرنے والے ۲۱۷ افراد تھے اور زخمی ہونے والے ۴۷۱۳ افراد۔ یہ قتل و غارت گری ۴۹ روز تک بپا رہی۔ ۱۹۳۳' ۱۹۳۴ اور ۱۹۳۵ء میں نسبتاً کم لوگ ہلاک اور زخمی ہوئے۔ ۱۹۳۶ء میں ۹۴ ہلاک اور ۶۳۲ افراد شدید زخمی ہوئے۔ یہ سلسلہ ۶۵ روز تک جاری رہا۔ ۱۹۳۷ء میں قدرے سکون رہا۔ اس سال ۱۱ افراد ہلاک اور ۸۵ شدید زخمی ہوئے۔ تین ہفتوں میں ان پر قابو پا لیا گیا ۱۹۳۸ء میں صرف ایک ہنگامے میں' جو محض اڑھائی گھنٹے جاری رہا' ۱۲ افراد ہلاک اور سو سے زائد زخمی ہوئے۔ اس کے بعد حالات بتدریج خراب سے خراب تر ہوتے چلے گئے۔ یہاں یہ بات یاد دلا دیں کہ بمبئی سب سے زیادہ پرامن شہر گردانا گیا ہے۔ اور اس

کے ساتھ وہ کوششیں بھی ذہن میں رہیں جو مسٹر گاندھی --- ہندو مسلم اتحاد کی خاطر مسلسل جاری رکھے ہوئے تھے۔

حیرت ہے کہ ہمارے نام نہاد آزاد خیال دانش ور اتنی بڑی حقیقت کو خاطر میں نہیں لاتے اور لفظ "انڈیا" کے سحر میں گرفتار رہتے ہیں۔ اپنے خیالی تصورات سے چھٹکارا پا کر ایک دفعہ یہ لوگ ایسے واقعات کا قریب سے مشاہدہ کر سکیں تو ان کی آنکھیں کھل جائیں۔ مثال کے طور پر مالابار کی آخری دفعہ کی تباہی دیکھی نہیں جاتی تھی۔ جس میں مارے جانے والے مسلمانوں کی لاشوں کے ڈھیر لگ گئے تھے اور عورتوں کے سینے چاک کر کے انہیں سڑکوں پر پھینک دیا گیا تھا۔ جو لوگ آنکھیں بند کر کے فیصلہ صادر کر دیتے ہیں کہ فرقہ واریت کی آگ برطانیہ کی بھڑکائی ہوئی ہے' انہیں موقع پر جا کر معلوم کرنا چاہئے کہ وہاں کیا ہوا۔ کوہاٹ میں ایک دفعہ ایک ایسی نظم ہنگاموں کا باعث بن گئی جس میں اسلام کے خلاف کچھ باتیں تھیں۔ کاغذ کے اس چھوٹے سے ٹکڑے کی وجہ سے ۱۵۵ مرد اور عورتیں ہلاک اور زخمی ہوئے۔ لاکھوں روپے کی جائدادیں تباہ ہوئیں اور ہزاروں لوگ خوف کے مارے وہاں سے بھاگ گئے۔

پورے ہندوستان میں یہی حال ہے۔ کہیں کسی ہندو دیوتا کی بے حرمتی ہو گئی ہے' کہیں مسلمانوں کے اللہ کی بے ادبی' کسی مذہبی جلوس پر کسی نے اینٹ دے ماری' مسلمان عبادت میں مصروف تھے کہ کسی نے بانسری بجا دی۔ بس پھر کیا ہوتا کہ دونوں طرف سے چھرے اور رائفلیں لے کر لوگ میدان میں آ جاتے اور ہفتوں' مہینوں ملک فسادات کی آگ میں جلتا رہتا۔ جسے بالآخر برطانوی فوج کے جوان آ کر ٹھنڈا کرتے۔ کراچی میں پچیس ہزار کے ایک مشتعل ہجوم کو جو ایک ہندو کے مسلمان قاتل کو' جس نے اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی کی تھی' سزا دیئے جانے کے خلاف جمع ہو گیا تھا' پچیس برطانوی جوانوں کی ایک پلاٹون بلا کر منتشر کرنا پڑا۔ کیونکہ پولیس ناکام ہو گئی تھی۔ فوج کو مجبوراً گولی چلانا پڑی' جس میں ۷۴ افراد مارے گئے۔ اس پر کانگرس نے آسمان سر پر اٹھا لیا کہ "سامراج" نے ظلم کی انتہا کر دی۔

ہندو مسلم منافرت اتنی عام اور مشہور و معروف ہے کہ اس پر کچھ کہنا سننا وقت ضائع کرنا ہے۔ یہ خونی پس منظر پاکستان کی اصل بنیاد ہے۔ ان کی آپس کی یہ خونریزی قیامت تک ختم نہیں کرائی جا سکتی۔ پھر بھی کچھ لوگ توقعات وابستہ کئے بیٹھے ہیں کہ دنیا میں ایسی قومیں موجود ہیں کہ جنہوں نے کوشش کر کے ایک نہ ایک دن آپس کی نفرتوں پر قابو پا لیا اور آخر کار مل جل کر رہنے لگیں۔ مگر وہ کون سے عناصر ہیں کہ جن سے کوئی قوم تشکیل پاتی ہے۔ "رینن" (Renan) نے بڑی خوبصورتی سے یہ عناصر بیان کئے ہیں اس کا کہنا ہے کہ دو چیزیں کسی قوم کو وجود میں لاتی ہیں۔ ایک ماضی اور دوسرا حال۔ ماضی کا خوبصورت مشترک ورثہ' دوسرے مل جل کر رہنے کی خواہش اور امنگ۔ یعنی ماضی میں انہوں نے اکٹھے مل کر کوئی نمایاں کارنامے انجام دیئے ہوں اور آئندہ بھی ویسے ہی کارنامے سرانجام دینے کا جذبہ موجود ہو۔ اب اس پر ہندوستان کو قیاس کریں تو مسلمانوں کا ماضی یہ تھا کہ انہوں نے ہندوستان پر آٹھ سو برس حکمرانی کی تھی جبکہ ہندو اس کا بدلہ چکانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ ہندوؤں کے ہیرو پرتھوی راج' پرتاپ' شیوجی اور بیراجی بیر ہیں' جنہوں نے مسلمانوں کے خلاف جنگیں لڑی تھیں۔ مسلمانوں کے نزدیک محمد بن قاسم اور اورنگ زیب قومی ہیرو ہیں۔ گویا دونوں کے ہاں ماضی کا قیمتی ورثہ تو ہے مگر وہ ہے نفرتوں کا ورثہ اور یہ سلسلہ یہیں رک نہیں جاتا۔ اب پاکستان کے مطالبے نے ماضی کی ان تمام نفرتوں کو ایک ساتھ سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ آخر اتنا عرصہ ہندو اور مسلمان جیسے تیسے اکٹھے گزارہ تو کرتے رہے ہیں' اب بھی کر لیں گے حالانکہ پاکستان کے مطالبے میں "حکومت خود اختیاری" کے سبب شدت پیدا ہوئی ہے۔ اس لئے کہ حکومت خود اختیاری دراصل ہندو حکومت تھی۔ چنانچہ جونہی ہندو کو اقتدار حاصل ہوا اس نے مسلمان کا جینا حرام کر دیا اور اسے بتا دیا کہ انگریز کے جانے کے بعد اس کا کیا حشر ہو گا۔

۱۹۳۵ء کے ایکٹ کی رو سے آزادانہ انتخابات کے ذریعے گیارہ صوبوں میں جو نمائندہ حکومتیں قائم ہوئی تھیں' ان میں سے سات صوبوں میں کانگرس کو بھاری اکثریت حاصل تھی۔ جس کے نتیجے میں کانگرس کا اصل چہرہ بے نقاب ہو کر فوراً سامنے آ گیا۔ اس نے سیاسی سطح پر ہی نہیں ہر شعبے میں مسلمانوں کا ناک میں دم کر دیا۔ اردو کی جگہ ہندی کو رائج کرنے کی زبردست مہم شروع کر دی۔ سکولوں میں مسلمان بچوں کو گاندھی کی تصویر کو سلامی دینے پر مجبور کیا گیا۔ کانگرس کے لئے پولیس کو کھلی چھٹی دے دی۔ غرضیکہ تجارت سے لے کر کھیتی باڑی تک ہر معاملے میں مسلمانوں کو امتیازی سلوک کا نشانہ بنایا گیا۔ حالانکہ مسلمانوں کا اعتماد حاصل کرنے کا یہ بہترین موقع تھا اور حکومت برطانیہ کا مقصد بھی یہ تھا کہ ہندوستان کے لوگوں کو مل جل کر ملک کو چلانے کی تربیت حاصل ہو۔ مگر کانگرس کے تعصب اور ہٹ دھرمی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جنگ عظیم دوم شروع ہونے پر جب کانگرسی وزیروں نے استعفے دے دیئے تو مسٹر جناح کے اعلان پر پورے ہندوستان میں مسلمانوں نے یوم تشکر منایا۔

جہاں تک "رینن" کے بیان کردہ دوسرے نکتہ' یعنی مل جل کر رہنے کی خواہش کا تعلق ہے' تو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان یہ خواہش ایسے ہی ہے جیسے فرانسیسوں اور جرمنوں یا امریکیوں اور جاپانیوں کے درمیان پائی جانے والی کیفیت ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر امبیدکر کے بقول ہندو اور مسلمان ہر معاملے میں ایک دوسرے کو مات دینے میں سرگرم عمل رہتے ہیں۔ ہندو بنارس یونیورسٹی بنائیں گے تو مسلمان بھی علی گڑھ یونیورسٹی بنائیں گے۔ ہندوؤں کی آر۔ ایس۔ ایس ہے تو مسلمانوں کی خاکسار۔ دونوں ایک دوسرے سے خائف ہیں کہ جسے موقع مل گیا وہ دوسرے کو ختم کر دے گا۔ اگرچہ گاندھی انڈیا کی یک جہتی اور مشترکہ قومیت کا ہر وقت راگ الاپتے رہتے ہیں مگر ہندوؤں کی اکثریت اس کی بالکل قائل نہیں۔ اپنے ایک حالیہ صدارتی خطبہ میں مہاسبھا کے مسٹر وی۔ ڈی ساورکر نے یہ کہہ کر زبردست داد وصول کی کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کا ہے۔ ہم ایک قوم ہیں۔ ہم اس دھرتی ماتا کے محافظ ہیں۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان کہاں جائیں؟ جواب یہ ہے کہ جہاں بھی جائیں ہندوستان پر ان کا کوئی حق نہیں۔ مہاسبھا والے نہ ان کو پسند کرتے ہیں اور نہ یہ چاہتے ہیں کہ وہ یہاں رہیں' بلکہ وہ سرے سے انہیں تسلیم نہیں کرتے۔ مسلمانوں کا کہنا ہے کہ ہم الگ قوم ہیں جو کہ ایک حقیقت ہے۔ ہندوؤں کی اکثریت کا بھی یہی دعویٰ ہے کہ ہم ایک الگ قوم ہیں۔ ان کا یہ دعویٰ بھی بالکل صحیح ہے۔ مگر جب مسلمان اس حقیقت کو عملی جامہ پہنانے کی بات کرتے ہیں تو یہی ہندو آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ کانگرس کی توپوں کے دہانے آگ اگلنے لگتے ہیں۔ گاندھی مرن برت رکھ لیتے ہیں کہ بھارت ماتا کے ٹکڑے نہیں ہونے دیں گے۔

تو بات کیا ہوئی۔ اصل بات ساری مفادات کی

ہے۔ وہی پرانا چکر' جو دنیا میں تمام جھگڑوں کی جڑ ہے۔

ایک مسلم لیگی ترجمان کی یہ بات دل کو لگتی ہے کہ پاکستان کی مخالفت صرف اس لئے ہے کہ مسلمانوں کا خون چوسنا ہندوؤں کی گھٹی میں پڑ چکا ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ یہ شکار ہاتھ سے نکل جائے۔ کانگرس پر ہندو سرمایہ دار کی گرفت کو دیکھتے ہوئے یہ بات سچ معلوم ہوتی ہے۔ ہندو بنئے کی نظریں پنجاب کی زرخیز زمینوں اور معدنی وسائل سے مالا مال ان علاقوں پر ہیں جو پاکستان بننے پر اس کے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ لہذا ہندو کبھی پاکستان کو قبول نہیں کرے گا۔ وہ اس کے لئے روئے گا' چلائے گا رشوتیں دے گا۔ دھمکیاں دے گا اور سب سے بڑھ کر ایسے لوگ موجود ہیں جن کی امانت و دیانت ہر شک و شبے سے بالاتر ہے مگر ان کی آنکھوں پر ہندوازم کی پٹی بندھی ہوئی ہے اور وہ نادانستہ طور پر ہندوؤں کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔ ان میں جواہر لال نہرو بھی شامل ہے' جس نے اس وقت جب سارا ملک خون میں ڈوبا ہوا تھا بڑی معصومیت سے امریکہ تار ارسال کر دیا کہ بس چند سر پھرے لوگ ہیں جو فساد برپا کر رہے ہیں ورنہ ہندو اور مسلمان میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

بہرحال پاکستان کے مطالبے کو ابھی بمشکل چار سال ہوئے ہیں۔ کوئی بھی اس پر کان دھرنے کو تیار نہیں۔ پاکستان کی بھرپور مخالفت ہوگی۔ اس کے بارے میں جھوٹے دعوے کئے جائیں گے' افواہیں پھیلائی جائیں گی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ان تمام آزمائشوں میں یہ سرخرو رہے گا اور پاکستان وجود میں آ کر رہے گا۔ اب اگلا پروگرام اس مملکت کے مستقبل کے سربراہ' مسٹر ایم ۔ اے جناح سے ملاقات کا ہے جسے بجا طور پر ایشیا کا مرد عظیم قرار دیا جا سکتا ہے۔

ایک مرد عظیم سے ملاقات

ایشیا میں انتہائی اہم شخصیت کا حامل' سرسٹھ سالہ دراز قد دبلا پتلا اور خوش پوش انسان' جسے دیکھ کر سپین کی کسی ممتاز شخصیت کا گمان ہوتا ہے' پرانی طرز کا ایک مدبر انسان۔ میں نے مسٹر جناح کو ایشیا میں انتہائی اہم شخصیت قرار دیا ہے۔ یہ کوئی لفاظی نہیں' ایک حقیقت ہے' آپ چاہے اس سے اختلاف کریں۔ آنے والے دور میں انڈیا دنیا کے لئے ایک بہت بڑا مسئلہ بن کر سامنے آئے گا' جس میں مسٹر جناح کو کلیدی اہمیت حاصل ہوگی۔ وہ اس جنگ کو ادھر یا ادھر' جدھر چاہے گا' لے جائے گا۔ دس کروڑ مسلمان اس کے آگے پیچھے' دائیں بائیں' اس کے اشارے پر چلنے کو تیار ہوں گے۔ یہ حیثیت ان کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں' جو بہت بڑی بات ہے۔ ہندوؤں میں یہ بات نہیں ہے۔ اگر گاندھی چلا جاتا ہے تو اس کی جگہ لینے کے لئے نہرو یا راج گوپال اچاریہ یا پٹیل یا درجن بھر دوسرے اشخاص موجود ہیں۔ مگر جناح کے بعد کون ہے؟ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ مسلم لیگ کی تحریک ختم ہو جائے گی۔ ہاں! ان کے بعد وہ رخ کون سا اختیار کرتی ہے' یہ الگ بات ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اصل راہ سے ہی بھٹک جائے۔ لیکن جب تک جناح موجود ہے' اس کا غلط رخ پر مڑنے کا کوئی امکان نہیں۔ میں پہلی مرتبہ ان سے ۱۸/ دسمبر ۱۹۴۳ء کو ملا تھا۔ انہوں نے مجھے آدھ گھنٹہ دینے کا وعدہ کیا تھا مگر ہماری ملاقات لگ بھگ تین گھنٹے جاری رہی۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر بڑی عمدگی کے ساتھ گفتگو کی' جس کا حاصل یہاں پیش ہے۔

س : میرا پہلا سوال تھا کہ آپ کے مخالفین سب سے زیادہ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ آپ نے پاکستان کی پوری طرح وضاحت پیش نہیں کی۔ دفاع' معیشت' اقلیتوں وغیرہ سے متعلق بہت ساری باتیں ایسی ہیں جنہیں آپ دانستہ طور پر نامکمل چھوڑ دیتے ہیں۔ آپ کے خیال میں کیا یہ محض تنقید برائے تنقید ہے؟

ج : ایک انگریز کے منہ سے' جسے اپنی تاریخ سے بھی کچھ واقفیت ہو' یہ سوال اچھا نہیں لگا۔ جب آئرلینڈ کی برطانیہ سے علیحدگی عمل میں آئی تھی تو علیحدگی کی شرائط پر مبنی جو دستاویز تیار کی گئی' وہ کل دس سطروں پر مشتمل تھی۔ ایک ایسے جھگڑے کا تصفیہ جو صدیوں سے برطانیہ کے لئے درد سر بنا رہا تھا' صرف دس سطروں میں طے پا گیا۔ ساری تفصیلات آئندہ کے لئے چھوڑ دی گئی تھیں۔ میں تو دنیا کے سامنے دس سطروں سے کہیں زیادہ مواد پیش کر چکا ہوں' جس میں پاکستان سے متعلق عام اصول و ضوابط درج ہیں۔ لیکن اس سے آگے مستقبل کے بارے میں تفصیلات پہلے سے فراہم کرنا کسی بھی شخص کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ ویسے بھی ہندوستان کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اس قسم کی تفصیلات سرے سے غیر ضروری ہیں۔ گول میز کانفرنس میں برما کی علیحدگی کے بارے میں کوئی تفصیلات طے نہیں کی گئی تھیں۔ اسی طرح کا معاملہ بمبئی سے سندھ کی علیحدگی کے موقع پر ہوا۔ کیونکہ اس کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔ اصولی طور پر علیحدگی کا فیصلہ کر لیا گیا تھا' جس کے بعد کام تدریجاً آگے بڑھتا رہا۔

س : پاکستان کے بارے میں بنیادی اصول آپ کس طرح بیان کریں گے؟

ج : صرف پانچ الفاظ میں --- مسلمان ایک قوم ہیں "The Muslims are a Nation" ۔ اگر آپ یہ مانتے ہیں تو اصولی طور پر آپ پاکستان کو بھی لازماً مان جائیں گے۔ آپ اس کا انکار کر ہی نہیں سکتے خواہ اس کی راہ میں اس سے سینکڑوں گنا زیادہ رکاوٹیں کیوں نہ پیدا ہو جائیں' جو اس وقت موجود ہیں۔ بہرحال اگر آپ اتنی واضح بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں تو مزید کیا کہہ سکتا ہوں۔ بات تو یہیں ختم ہو گئی۔

س : آپ مسلمانوں کو مذہب کے حوالے سے ایک قوم کہتے ہیں؟

جواب : ایک حد تک ۔ مگر صرف یہی ایک سبب نہیں ہے۔ آپ جانتے ہوں گے کہ اسلام محض ایک مذہبی عقیدہ ہی نہیں مکمل ضابطہ حیات ہے۔ میں زندگی کے ہر اہم شعبے کے بارے میں کہہ سکتا ہوں۔ ہماری تاریخ' ہمارے ہیرو' ہمارا طرز تعمیر' ہمارا میوزک' ہمارے قوانین اور عدالتی نظام' غرضیکہ ہر اہم معاملہ اسلام کے تحت ہے۔ اس موقع پر میں نے درخواست کی کہ ساری باتیں تحریر کرنا چاہتا ہوں۔ جناح صاحب نے قدرے توقف کے بعد بات جاری رکھتے ہوئے کہا' ان تمام باتوں میں بنیادی طور پر ہمارا نقطہ نظر مختلف ہی نہیں' ہندوؤں سے دشمنانہ ہے۔ ہم ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں کوئی ایک شے بھی مشترک نہیں ہے' ہمارے نام' لباس' کھانے مختلف' ہماری معاشی زندگی' ہمارے تعلیمی تصورات' خواتین سے ہمارا سلوک' جانوروں کے بارے میں ہمارا رویہ' قدم قدم پر ہمارا ایک دوسرے سے ٹکراؤ ہوتا ہے۔ صرف ایک گائے کی مثال لے لیں۔ ہم گائے کا گوشت کھاتے ہیں' ہندو گائے کو پوجتے ہیں۔ بہت سارے انگریز سمجھتے ہیں کہ گائے کی پوجا محض کوئی روایتی یا علامتی شے ہے۔ حالانکہ اس پر زبردست ہنگامے ہوتے ہیں۔ تھوڑا توقف کرنے کے بعد پوچھا' آپ نے کیا لکھا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ میں نے صرف یہ لکھا ہے کہ مسلمان ایک قوم ہیں --- تو کیا آپ اسے تسلیم کرتے ہیں؟ میں نے عرض کیا جی ہاں! جناح صاحب نے مسکراتے ہوئے پوچھا اور کوئی

سوال؟

س: معیشت کے بارے میں سوال ہے۔ پاکستان میں مسلمان پہلے کی نسبت خوشحال ہوں گے یا غریب اور بقیہ ہندوستان کے ساتھ آپ درآمد برآمد کا طریقہ اختیار کریں گے؟

ج: ذرا بات سمجھانے کے لئے میں، آپ سے ایک سوال پوچھتا ہوں۔ اگر آپ سے کوئی یہ پوچھے کہ آپ ایک خوشحال انگلستان کو جو جرمنی کا غلام ہو ترجیح دیں گے یا غریب مگر آزاد انگلستان؟ میں نے عرض کیا کہ میرے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ جناح صاحب فرمانے لگے۔ تمہارا یہ سوال سطحی سا نہ تھا؟ مسلمان کوئی گئے گزرے نہیں ہیں۔ اگر شروع میں کچھ مسائل ہوئے بھی تو دس کروڑ مسلمان ایک آزاد ملک میں رہتے ہوئے اس سے تو بہتر ہوں گے کہ ------ پچاس کروڑ ہندوؤں کی غلامی میں جابجا دھکے کھا رہے ہوں۔ خصوصاً جب ہندوؤں کا ارادہ ہی یہ ہو کہ ان کا استحصال کرنا ہے۔ یورپ والوں کو کیا حق حاصل ہے کہ ہمیں معاشیات پڑھائیں جبکہ خود ان کا معاہدہ ورسیلز سمجھ میں آنے والی شے ہی نہیں۔ ہمارا مسئلہ تو اس سے کہیں آسان ہے۔ اپنا نہیں دیکھتے کہ کس طرح یورپ کو مصنوعی اور باہم متصادم حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔

س: دفاع کے معاملے میں بھی آپ مطمئن ہیں؟

ج: بالکل! افغانستان کا دفاع کون کر رہا ہے؟ خود افغان۔ ہم بھی اپنا دفاع کریں گے۔ ہم بزدل نہیں ہیں۔ لڑنا بھی جانتے ہیں۔ اور پھر دفاع ہمارا کوئی الگ مسئلہ نہیں، دوسرے ممالک بھی تو ہیں، مثلاً ایران۔ ایک عارضی تعطل تو پیدا ہوگا مگر ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ برطانیہ آج ہی رخصت ہو جائے۔ اس نے جو یہ سب کچھ گڈمڈ کر رکھا ہے اسے سلجھا کر جائے اور ہاں! مجھے یاد آیا ایک چیز آپ کو دکھاتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ کمرے سے چلے گئے۔ میں سگرٹ سلگا کر ان کا انتظار کرنے لگا۔ جناح برطانیہ پر زبردست تنقید کر رہے تھے۔ مگر ان کی باتوں میں وزن تھا۔ ان کے مقابلے میں کانگرس والوں کی اکثر باتیں بے تکی ہوتی ہیں۔ جناح اور کانگرسی لیڈروں میں وہی فرق تھا جو ایک ماہر سرجن اور کسی عطائی ڈاکٹر میں ہوتا ہے۔ اتنی دیر میں جناح صاحب ایک کتاب ہاتھ میں لئے واپس تشریف لائے۔ انگریزوں کا مزاج ہے کہ انہیں جو کام اچھا نہ لگے وہ اس سے کنی کتراتے ہیں اور انتظار کرنے لگتے ہیں کہ خود بخود مسئلہ حل ہو جائے۔ لیکن جب سوچ بچار کرنے کی زحمت گوارا کر لیتے ہیں تو بات کی تہہ تک پہنچ کر دم لیتے ہیں۔ جان برائٹ انہی لوگوں میں سے تھے جو باقاعدہ حقیقت کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ نے کبھی ان کی کوئی تقریر پڑھی ہے؟ سکول سے فارغ ہونے کے بعد تو نہیں، میں نے عرض کیا۔ تو یہ دیکھیں گزشتہ روز اتفاق سے میری اس پر نظر پڑ گئی۔ اور یہ کہہ کر کتاب میری طرف بڑھا دی۔ یہ ایک پرانا نسخہ تھا، نام تھا "جان برائیٹ کی تقاریر"۔ اور جو صفحہ سامنے تھا اس پر تقریر کی تاریخ تھی۔ ۴/جون ۱۸۵۸ء ہاؤس آف کامنز میں ان کی اس تقریر کا لب لباب یہ تھا۔

انگلستان کب تک ہندوستان پر حکمران رہے گا؟ کوئی بھی یہ نہیں بتا سکتا۔ پچاس سال، سو سال یا پانچ سو سال۔ مگر جس شخص میں ذرہ برابر بھی سوجھ بوجھ کا مادہ ہے، وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اتنے بڑے ملک کو، جس میں کم سے کم بیس مختلف قومیں اور بیس قسم کی زبانیں بولی جاتی ہیں، تادیر ایک ملک کے طور پر یکجا رکھا جا سکتا ہے۔ میں بہرحال یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں۔ میں نے کتاب واپس کی، جناح صاحب کہہ رہے تھے، برائٹ کی وہ بات آج ہمیں سمجھ آ رہی ہے ہندو اور مسلمان اس وقت ایک قوم نہیں بن سکتے جب تک مسلمان مسلمان رہتا ہے۔ متحدہ انڈیا کا مطلب سوائے ہندو انڈیا کے کچھ نہیں۔ انڈیا برطانوی اختراع ہے، جس کا صرف کاغذی وجود ہے۔

س: لیکن مسئلہ تو یہ ہے کہ آپ کے مخالفین پاکستان کو برطانیہ کی اختراع قرار دیتے ہیں۔ اسے وہ دھڑوں میں بانٹو اور ان پر اپنا اقتدار جمائے رکھو (divide and rules) کی پالیسی کا تسلسل قرار دیتے ہیں۔

ج: (قدرے تلخ لہجہ میں) جو شخص یہ بات کہتا ہے اسے میری دیانت کے علاوہ برطانیہ کی عقل کے بارے میں بھی شک ہے۔ برطانیہ کے ہندوستان پر تسلط کی بنیاد ہی متحدہ ہندوستان ہے، جس کی گاندھی وکالت کرتے ہیں۔ میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ متحدہ ہندوستان انگریز کی پیداوار ہے، جو بالکل مصنوعی ہے اور یہ تصنع انتہائی ہولناک ہے، جس کے نتیجے میں کبھی نہ ختم ہونے والا جھگڑا فساد شروع ہو سکتا ہے۔ یہی جھگڑا فساد ---- برطانیہ کے ہندوستان میں موجود رہنے کا بہانہ فراہم کرے گا، یہاں سے چھوڑ کر چلے جانے پر تقسیم کرو اور حکومت کرو، کے فامولے کا اطلاق نہیں ہوتا۔

س: گویا آپ کا کہنا ہے کہ "تقسیم کرو اور چلے جاؤ" divide and quit

ج: بالکل!

س: آپ کو معلوم ہے برطانوی عوام کو اس سے کتنا صدمہ ہوگا؟

ج: حقائق اکثر تلخ ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ بھی ایسی ہی ایک حقیقت ہے۔

س: وجہ یہ ہے کہ برطانوی عوام کے سامنے کانگرس کے نقطۂ نظر کے سوا دوسرا کوئی پہلو ہے ہی نہیں۔

مغرب میں مسلمانوں کی ترجمانی کا حق ادا کرنے کے لئے کوئی ایک شخص بھی تو موجود نہیں ہے۔

ج: (افسردگی کے ساتھ) میں جانتا ہوں۔ ہندوؤں کے پاس طاقتور پریس اور منظم جماعت ہے۔ مہاسبھا کی پشت پر ہندو سرمایہ دار اور صنعت کار ہے۔ جو ہمیں میسر نہیں۔

س: برطانیہ میں کانگرس کو ہی "انڈیا" خیال کیا جاتا ہے، جس نے اٹوٹ انڈیا کی رٹ لگا رکھی ہے۔ چنانچہ کوئی بھی یہ ماننے کو تیار نہیں کہ انڈیا کو تقسیم کرنا شرافت کا کام ہے۔ میں مانتا ہوں کہ یہ حقیقت پسندانہ طرز عمل نہیں ہے لیکن جمہوریت میں جو ہمارے ہاں رائج ہے، رائے عامہ کو نظرانداز کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ لہٰذا انہیں بتانا ہوگا کہ شرافت، رواداری اور نیک نیتی کے اظہار کا واحد طریقہ یہ ہے کہ برطانیہ یہاں سے رخصت ہو اور حکومت حوالے کردے۔

ج: ساتھ ہی اضافہ کر لیجئے کہ اس کا واحد محفوظ راستہ ہے۔ پاکستان!

پاکستان کی اہمیت کا اندازہ، اس کے پیچھے جو جذبہ کار فرما ہے، کم از کم اس حد تک تو، اس گفتگو سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ پورے منصوبے کو تفصیلات کے ساتھ اس سائز کی کتاب میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ اس کے لئے ڈھیروں نقشے اور اعداد و شمار درکار ہیں۔ جن کی یہاں ضرورت نہیں۔ جو شخص بھی ان باتوں پر سنجیدگی سے غور کرنے کی زحمت گوارا کرے گا وہ پاکستان کا قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ بشرطیکہ اس کی آنکھوں پر تعصب کی پٹی نہ بندھی ہوئی ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک بڑا اقدام ہوگا۔ مگر انفرادی زندگی کی طرح قوموں کی زندگی میں بھی ایسے لمحات اکثر آتے رہتے ہیں کہ غیر معمولی اقدام ناگزیر

ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ویسا ہی لمحہ ہوگا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین تسلسل کے ساتھ جو ناچاقی پائی جاتی ہے' وہ کینسر کی طرح یہاں کی سیاسی زندگی میں سرایت کرچکی ہے اور کینسر کا علاج سوائے بڑے آپریشن کے کوئی نہیں ہوتا۔ گاندھی کے فلسفے اور برطانیہ کی طفل تسلیاں بیکار کی چیزیں ہیں۔ یہاں سنار کی ٹھک ٹھک کے بجائے لوہار کا ایک ہی ہتھوڑا درکار ہے۔

پاکستان سے متعلق بحث مباحثے میں جو بات عجیب دکھائی دیتی ہے وہ رفتہ رفتہ پاکستان کے حق میں استوار ہونے والی حقیقت پسندانہ رائے عامہ اتنی نہیں ہے جتنی انڈیا کے بھی خواہوں کی مخالفت ہے۔ ہندوؤں کو چونکہ ذرائع ابلاغ پر اجارہ داری حاصل ہے' اس لئے انہوں نے مسلسل پروپگنڈے کے زور سے دنیا کو یہ باور کرا دیا ہے کہ پاکستان برطانیہ کی divide and rule پالیسی کا مظہر ہے۔ حالانکہ سادہ سی بات ہے کہ اقتدار کو طول دینے کے لئے لوگوں کو اکٹھا رکھنا ضروری ہوتا ہے' نہ کہ ان میں افتراق و انتشار۔ یعنی Unite and Rule اور Divide and Quit کانگرس کے پروپیگنڈے کا یہ شاہکار ہے کہ جو لوگ سب سے زیادہ اقلیتوں کے حقوق کا رونا روتے ہیں وہ اس پروپیگنڈے سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔

میرے ایک دوست کا یہ باب پڑھنے کے بعد کہنا تھا کہ جناح کی تمام باتیں دل کو لگتی ہیں لیکن دیکھنا ہوگا کہ وہ کتنے مسلمانوں کے واقعتاً نمائندہ ہیں۔ کیا مسلم لیگ پورے ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے؟ اگر تو یہ بات ہے تو سمجھئے' انہوں نے پاکستان کا مقدمہ جیت لیا' لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو تمہارے سارے دلائل بے معنی ہیں۔

یہ بہت اہم سوال تھا' جس کا جواب دینا ضروری ہے اور وہ جواب بہت ہی آسان ہے۔ اگر مسلم لیگ ہندوستانی مسلمانوں کی نمائندہ جماعت نہیں ہے تو پھر نہایت ادب کے ساتھ یہ پوچھنا چاہوں گا کہ وہ کون سی جماعت ہے جو فی الواقع ان کی نمائندہ ہے؟ اور اس کا مطالبہ کیا ہے؟ وہ کہاں چھپی ہوئی ہے؟ حیرت ہے کہ کانگرس کو بھی آج تک اس کا پتہ نہیں چلا اور وہ خواہ مخواہ مسلم لیگ کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ ہر معاملے میں کانگرس مسلم لیگ کے ساتھ رابطہ کرتی ہے۔ اس کا بہت اہم سبب ہے۔ مسلم لیگ کا مطالبہ ہر مسلمان کے دل کی آواز ہے۔ جو لوگ صرف اعداد و شمار کی زبان سمجھتے ہیں ان کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ گزشتہ سات برسوں میں پورے ہندوستان میں جہاں بھی ضمنی انتخابات ہوئے اور ان میں مسلمان امیدواروں نے حصہ لیا' جیت ہمیشہ مسلم لیگی امیدوار کی ہوئی۔ خود مرکزی دستوریہ میں تیس مسلمان نشستوں میں سے اٹھائیس مسلم لیگی ہیں۔ کیا اس کے بعد بھی کسی شک وشبے کی گنجائش باقی رہتی ہے۔OO

مکتوب کراچی

اسلام میں زمین اور جغرافیائی حدود کو کوئی تقدس حاصل نہیں

صوبوں کی تقسیم اور ڈاکٹر اسرار احمد کا مؤقف

بھارت "ماتا" کے ٹکڑے ہو سکتے ہیں تو پاکستانی صوبوں کی تقسیم کیوں ممکن نہیں!

نجیب صدیقی

۳ جنوری ۱۹۹۵ء کو کراچی میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے تنظیم اسلامی کے امیر جناب ڈاکٹر اسرار احمد نے فرمایا کہ سندھ میں اس وقت جو بے چینی پائی جاتی ہے' خصوصاً شہری علاقوں میں' اس کا واحد حل یہ ہے کہ پاکستان کے تمام صوبوں کی از سر نو حد بندی کی جائے اور چھوٹے صوبے بنا دیئے جائیں۔ ان کا کہنا تھا کہ کوئی صوبہ بھی ایک کروڑ کی آبادی سے زیادہ نہیں ہونا چاہئے۔ اس طرح اس علاقے کے لوگوں میں اپنے مسائل خود حل کرنے کا داعیہ پیدا ہوگا۔ پھر ان کے نام بھی وہاں کے لوگوں کی مرضی کے مطابق رکھ دیئے جائیں تو اس میں بھی کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔ خواہ وہ نام زبان کی بنیاد پر ہی کیوں نہ ہوں' جیسے سرائیکی اور پختون وغیرہ۔ ہندوستان کی تقسیم کے وقت پنجاب کا جو حصہ ہندوستان میں آیا' وہ پاکستان کے پنجاب سے چھوٹا تھا۔ جب اس کے تین صوبے بن سکتے ہیں تو ہمارے یہاں مزید صوبے بنانے میں کیا قیامت ہے!!

اس وقت مسائل جس انداز پر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں' ان سے صرفِ نظر کرکے ہم خود اپنی تباہی کو دعوت دے رہے ہیں۔ ایک بڑے تجربے کے بعد بھی ہم نے عقل کے ناخن نہیں لئے۔ مشرقی پاکستان ہم سے کٹ گیا یا کاٹ دیا گیا اور یہ صرف اس وجہ سے ہوا کہ ہم نے حقائق کو سمجھنے سے گریز کیا۔ آج بھی کم و بیش وہی کیفیت ہے۔ اس بے چینی کو صرف اسی صورت سے دور کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر موصوف یہ بات بار بار کہہ چکے ہیں کہ خرابی کی اصل وجہ اس مقصد سے گریز ہے' جس مقصد کے لئے پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔ اگر اس مقصد کو بروئے کار لایا جاتا تو آج ہر سطح پر بے اعتدالی پیدا نہ ہوتی۔ اسلام ایک عادلانہ نظام دیتا ہے۔ تمام بسنے والوں کو عدل کی ترازو سے تل کرملتا ہے۔ دنیا کے تمام نظاموں میں بے اعتدالی پائی جاتی ہے' اس لئے کہ وہ انسانوں کے بنائے ہوئے نظام ہیں۔ آج انسان کے تراشیدہ نظام ہائے زندگی دنیا کے ہر گوشے میں ذلت سے دوچار ہو چکے ہیں۔ وہ نظام یا قوانین جس میں عقیدے کی چاشنی نہ ہو' کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اسلامی نظام یا قوانین اور ان کا نفاذ بذاتِ خود عبادت ہے۔ اس کے قائم کرنے کی جدوجہد ہر بالغ و عاقل مسلمان پر فرض ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ اپنی زندگی کے آخری لمحے تک اس جدوجہد میں کیسے شریک رہتے۔ ایک مسلمان کی عملی زندگی کا مشن ہی یہی ہے۔ اسے کس طرح چین آسکتا ہے کہ اس کا دین پامال ہو رہا ہے اور وہ چین سے اپنی دنیا میں منہمک ہے۔ دین کی پامالی کبھی غیروں کے ہاتھوں میں تھی' اب تو اپنے

لوگوں کے ہاتھوں میں ہو رہی ہے۔ اس پامالی میں ہر فرد بشر شریک ہے' سوائے ان لوگوں کے جو اس کے قیام کی جدوجہد میں شریک ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ آج عذاب کی مختلف صورتوں میں مسلم امہ گرفتار ہے۔ اپنے ملک میں عذاب کے مختلف گوشے نظر آ رہے ہیں۔ امن ختم ہو چکا ہے۔ قتل و غارت گری معمول بن چکے ہیں۔ نفرتیں انتہا کو چھو رہی ہیں۔ اسلامی تصورات کا تصور عنقا ہو گیا ہے۔ اس کی جگہ مذہبی' لسانی' گروہی عصبیتیں عروج پر ہیں۔ دل ایک دوسرے سے پھٹ چکے ہیں۔ ہر جماعت میں دراڑیں پڑ چکی ہیں اور حصے بخرے ہو رہے ہیں۔ گرانی نے زندگی اجیرن بنا رکھی ہے۔ دھوکہ' ملاوٹ اور بدعہدی پر اب کسی کو حیرانی نہیں ہوتی۔ اچھی قدریں روندی جا چکی ہیں۔ ہر روز کسی نہ کسی بڑے "فراڈ" کے کیس کی خبر اخبارات دیتے ہیں۔ ہر شخص سہما ہوا ہے۔ کوئی بھی گولی کسی وقت بھی آ کر اس کی زندگی کا چراغ گل کر سکتی ہے۔ ہر وقت کسی نہ کسی اہم خبر کو سننے کے لئے کان کھڑے رہتے ہیں۔ یہ سب عذاب کی صورتیں نہیں تو اور کیا ہیں۔ یہ خرابی اچانک پیدا نہیں ہوتی۔ اس قطرے کو گہر ہونے میں نصف صدی کے قریب کا عرصہ لگا ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ آنے والے خطرات سے قوم کو کسی نے آگاہ نہیں کیا۔

حالات کی نبض پر جن کی انگلیاں تھیں' انہوں نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی سے قبل ہی آگاہ کر دیا تھا۔ مگر اقتدار اور شراب کے نشے میں بدمست قیادت کے کان پر جوں تک نہیں رینگی اور مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔ اس ذلت اور رسوائی کے بعد تو عقل آ جانی چاہئے تھی۔ مگر اب ایسے محسوس ہوتا ہے کہ عقل اور سمجھ نام کی شے حکمرانوں سے رخصت ہو چکی ہے۔ ہماری قیادت کو ذاتی مفاد' پارٹی مفاد اور گروہی مفاد نے اندھا کر دیا ہے۔ حالات کا اندازہ کرنے کی صلاحیت شاید ختم ہو گئی ہے' یا یہ دانستہ گریز ہے ---- سندھ کے حالات عرصہ پچیس سال سے آہستہ آہستہ خراب ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ لیکن کسی نے اس کی اصلاح کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی' بلکہ ہر آنے والے نے اسے مزید بگاڑا ہے۔

امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ نے پندرہ سال قبل ہی بھانپ لیا تھا کہ یہ صوبہ ایک بڑے طوفان کی زد میں آنے والا ہے۔ آپ نے مسئلہ سندھ پر ایک کتاب لکھی اور سندھ کے تمام بڑے شہروں میں دورہ کر کے اس کتاب کو دانشوروں تک پہنچایا۔ بار ایسوسی ایشنوں کو خطاب کیا اور آنے والے خطرات سے آگاہ کیا۔ آپ خطاب جمعہ میں' جو لاہور میں ہوتا ہے' سندھ کے بارے میں بار بار اپنے موقف کو دہراتے رہے۔ اس وقت اگر موصوف کی بات مان لی جاتی تو آج یہ نوبت نہ آتی۔ اس وقت قتل و غارت گری جس انداز پر ہو رہی ہے' اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ کسی بڑی تباہی کے دہانے پر پہنچنے ہی والے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے مسئلہ کا حل جو اس وقت پیش کیا ہے اگر اسے تسلیم کر لیا جائے تو اس تباہی سے بچا جا سکتا ہے' ورنہ تباہی مقدر ہے۔ اس تباہی و بربادی کے بعد تجزیئے ہوتے رہیں گے' جس طرح آج "فال آف ڈھاکہ" پر درجنوں کتابیں موجود ہیں۔

ہماری علاقائیت پرستی پر مبنی سوچ نے صوبوں کی تقسیم کو اتنا حساس بنا دیا ہے کہ اس کی مثال آتش فشاں سے دی جا سکتی ہے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارے دین میں زمین کو وہ تقدس حاصل نہیں ہے جو دیگر مذاہب میں ہے۔ ہندو مذہب میں بھارت کے ساتھ "ماتا" کا لفظ لازمی بولا جاتا ہے۔ بھارت ماتا کی حیثیت ایک مقدس گائے کی تھی' آخر ضرورت کے تحت بھارت ماتا کے ٹکڑے ہوئے' مقدس گائے ذبح کی گئی۔ اس طرح ہندو قوم نے اسے قبول کیا۔ پاکستان کی پوری سرزمین کا کوئی حصہ ایسا مقدس نہیں ہے' جسے ضرورت کے تحت انتظامی یونٹ میں تقسیم نہ کیا جا سکے۔

اس طرح اگر یہ ملک ایک بڑی تباہی سے بچ سکتا ہے تو یہ سودا مہنگا نہیں ہے۔ کسی دانا کا قول ہے کہ "مل جل کر کام کرنے والوں کو برداشت کی زمین پر کھڑا ہونا پڑتا ہے" اصل علاج تو وہی ہے جس کا ذکر گزشتہ سطور میں کیا جا چکا ہے اور ڈاکٹر اسرار احمد نے اس مقصد کے حصول کے لئے اپنی زندگی وقف کر رکھی ہے۔ تنظیم اسلامی اسی مقصد کے لئے بنائی گئی ہے۔ اجتماعی کام کے لئے اجتماعی طاقت ضروری ہے۔ طاقت کی فراہمی تک اس کے حصول کی کوشش میں دن رات کھپانا آپ کا مشن ہے۔ ہر دور نے طاقت کی زبان کو سمجھا ہے' صرف پند و نصیحت سے کوئی انقلاب نہیں آیا۔

چھوٹے صوبوں کی تشکیل کے لئے دبی زبان سے کچھ لوگ بولتے رہے ہیں' مگر ان میں اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ اس پر کھل کر بات کریں' اس لئے کہ وہ اپنے ووٹر سے ڈرتے ہیں۔ حق بات ان کے گلے میں پھنس جاتی ہے۔ سچی بات یقیناً کڑوی ہوتی ہے' اس کے کہنے والے خال خال لوگ ہوتے ہیں۔ وہ دائیں بائیں دیکھ کر بات نہیں کرتے۔ جو حق سمجھتے ہیں' بیان کر دیتے ہیں' خواہ اس سے کوئی ناراض ہو یا خوش ہو۔ تحریکِ نظام مصطفیٰ جب اپنے عروج پر تھی تو ڈاکٹر صاحب موصوف نے ببانگ دہل کہا تھا کہ یہ نظامِ مصطفیٰ قائم کرنے کی تحریک نہیں ہے بلکہ یہ صرف بھٹو کو ہٹانے کی تحریک ہے۔ نظام مصطفیٰ کی تحریک کے لئے خالص سیکولر لوگ کیسے جمع ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ بات اکثر لوگوں کو پسند نہیں آئی۔ خود تنظیم اسلامی کے کچھ جذباتی رفقاء اس بات پر الگ ہو گئے مگر بعد میں ثابت ہوا کہ جو بات کہی گئی تھی وہ درست تھی' ڈاکٹر صاحب کا تجزیہ سو فیصد صحیح نکلا۔

بہرحال اس وقت ملکی حالات کے پیش نظر مسئلہ کے حل کے لئے چھوٹے صوبے بنانا ناگزیر ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کی یہ پختہ رائے ہے۔ اس کے اظہار پر آپ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں کرتے۔ اس بات پر اگرچہ بہت سے چہروں کا رنگ بدل جائے گا۔ کچھ لوگ بدک جائیں گے' کچھ مخالف ہو جائیں گے۔ اس بات کا بیان کرنا مصلحت کے خلاف معلوم ہوتا ہے مگر ڈاکٹر صاحب جس بات کو حق سمجھتے ہیں اسے بلا کم و کاست بیان کر دیتے ہیں۔

کراچی سے ناظم حلقہ سندھ و بلوچستان نے فون پر ڈاکٹر صاحب سے درخواست کی کہ آپ فی الحال اسے بیان نہ کریں' اس سے ہمارے بعض ساتھی ناراض ہو جائیں گے۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ میں منافقت نہیں برت سکتا۔ سیاسی لیڈروں کی طرح پنجاب میں کچھ کہوں اور سندھ میں کچھ کہوں' یہ میرے لئے ممکن نہیں ہے اور نہ ہی دین نے اس چیز کی تعلیم دی ہے۔ حق بات کہوں گا آج نہیں تو کل لوگوں کی سمجھ میں بات آ جائے گی۔ ڈاکٹر صاحب کا سابقہ تجزیہ بھی اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ آپ نے جس مسئلہ پر ڈٹ کر اظہار کیا ہے' وہ بعد میں صحیح ثابت ہوا ہے۔ OO

غرض ہے پیکار زندگی سے کمال پائے ہلال تیرا
جہاں کا فرض قدیم ہے تو' ادا مثال نماز ہو جا
وجود افراد کا مجازی ہستی قوم ہے حقیقی
فدا ہو ملت پہ' یعنی آتش زن طلسم مجاز ہو جا

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی، کچھ ہماری خبر نہیں آتی

بہاری کیمپوں میں رہنے والے ایک بوڑھے اور ایک جوان کا انٹرویو

بنگلہ دیش کے کیمپوں میں سڑنے والوں کا قصور .... پاکستان سے محبت ہی تو ہے !!

محمد سمیع

ہمیں امید ہے کہ ایک دن ہم پاکستان ضرور پہنچیں گے

قارئین کرام : آپ نے انٹرویو تو بے شمار پڑھے ہوں گے۔ سیاست دانوں کے انٹرویو، علماء کرام کے انٹرویو اور ہو سکتا ہے کہ ان کے انٹرویو بھی پڑھے ہوں گے جن کو دنیا فنکار کہتی ہے اور جن کا تذکرہ سنتے ہی ہم جیسے بزعم خود اہل تقویٰ کی پیشانیوں پر بل پڑ جاتے ہیں حالانکہ اس دنیا میں ہم سب فنکار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی ڈرامہ سیریل میں ہر ایک کو کوئی نہ کوئی کردار ضرور دیا ہے۔ لیکن ہم میں سے بہت تھوڑے ہونگے جو اپنے کردار کو بخوبی ادا کر رہے ہوں ورنہ اکثر و بیشتر اس میں ناکام ہی رہتے ہیں اور اس ناکامی کی بنا پر خسر الدنیا والاخرہ کی تصویر بن جاتے ہیں۔ بہرحال میں بات انٹرویو کی کر رہا تھا۔ میں نے بھی ایک انٹرویو کیا ہے جو عام انٹرویو سے بہت مختلف ہے، کیونکہ یہ انٹرویو خیالوں کی دنیا میں خیالی کرداروں کا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

بنگلہ دیش جو کبھی مشرقی پاکستان کہلاتا تھا، اس کا دارالحکومت ڈھاکہ ہے۔ ایئر پورٹ سے اتر کر ہم ایک رکشا میں بیٹھتے ہیں، جو یہاں بے بی ٹیکسی کہلاتا ہے۔ رکشا تو اس سائیکل رکشا کو کہتے ہیں جس پر کم از کم دو افراد سوار ہوتے ہیں اور ایک انسان اسے اپنے پیروں سے چلا رہا ہوتا ہے۔ ایوب خان مرحوم نے اپنے دور میں مغربی پاکستان کی حد تک اس سواری پر پابندی لگا دی تھی۔ لیکن یہ سواری آج بھی بنگلہ دیش میں لاکھوں افراد کی روزی کا ذریعہ ہے۔ بے شک یہ انسان پر ایک بڑا ظلم ہے، لیکن اس سے بڑا ظلم میں نے ہندوستان کے صوبہ مغربی بنگال کے دارالحکومت کلکتہ میں دیکھا ہے، جہاں انسان اگر ایک طرف رکشا پر بیٹھا ہوتا ہے تو اس رکشے کو ایک انسان ہی اس طرح کھینچ رہا ہوتا ہے، جس طرح ہمارے ملک میں تانگہ میں جتا ہوا گھوڑا یا خچر کھینچ رہا ہوتا ہے۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہم رکشے کے ذریعہ مضافات میں واقع بستی میرپور پہنچے تھے، جہاں جینوا کیمپ قائم ہے۔ میں ان کی حالت زار کا تذکرہ نہیں کروں گا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میں یا میرے قارئین سوائے اس کے کہ ان کے حالات زار پر دل میں کسک محسوس کریں اور کر بھی کیا سکتے ہیں!! آیئے کیمپ کے اس گوشے میں چلتے ہیں جہاں ایک بڑے میاں خلاؤں میں گھور رہے ہیں۔

"السلام علیکم"۔ لیکن بڑے میاں نے شاید سنا ہی نہیں۔ "اسلام علیکم ورحمتہ اللہ"۔ بڑے میاں ایک دم سے چونکتے ہیں۔ "وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ" وہ جواب دیتے ہیں۔ "بڑے صاحب کن خیالوں میں گم ہیں آپ"۔ اس سے پہلے کہ میں آپ کے اس سوال کا جواب دوں آپ یہ بتائیں کہ آپ کون لوگ ہیں؟"۔ چھوڑیئے اس تذکرے کو، بس یوں سمجھ لیجئے کہ کبھی ہم بھی آپ کے ہم وطن تھے۔ لیکن اب ہمارے وطن کا یہ حصہ تو بنگلہ دیش بن چکا ہے"۔ اچھا تو آپ پاکستان سے آئے ہیں۔ لیکن آپ نے یہ کیسے کہہ دیا کہ کبھی آپ بھی ہمارے وطن تھے۔ میں تو آج بھی اپنے آپ کو آپ کا ہم وطن سمجھتا ہوں۔ کیا ہوا میں اب تک اپنے پیارے وطن نہ پہنچ سکا۔ کیا اب بھی لاکھوں افراد وطن سے دور نہیں۔ اگر وہ تلاش معاش کے سلسلے میں وطن سے دور ہیں تو ہم ملک کے ٹوٹنے کی بنا پر۔ ملک ٹوٹا ہے، ملک سے رشتہ تو نہیں ٹوٹا"۔ میں دل ہی دل میں خجالت محسوس کرتا ہوں کہ میں نے کون سی بات کہہ دی۔ لیکن کیا کروں کہ یہ سوچ تو ہمارے وطن کے اس حصے کی اس عظیم اکثریت کی ہے۔ اگر ہم ان بدنصیبوں کو پاکستانی تصور کرتے تو یہ آج تک بنگلہ دیش کے کیمپوں میں زندگی کیوں گزار رہے ہوتے۔

"یہ بتائیں پاکستان سے بچھڑے ہوئے آپ لوگوں کو تقریباً ربع صدی ہونے والی ہے، کبھی آپ کے دل میں یہ خیال بھولے سے بھی آیا کہ پاکستان کے حق میں ووٹ ڈال کر آپ نے کوئی غلطی کی تھی"۔ جی ہاں مجھے یہ سوال کرنا تو نہیں چاہئے تھا لیکن آج پاکستان میں مقیم وہ طبقہ جس کو پہلے تو "پناہ گزین اور مکڑ" وغیرہ کے القاب سے نوازا جاتا تھا اور جو آج اپنے آپ کو مہاجر کی حیثیت سے پہنچوانا چاہتا ہے، اس کے شب و روز کچھ اس طرح گزر رہے ہیں کہ جس سے بیزار ہو کر آج کا نوجوان یہ سوچ رہا ہے کہ ہمارے بزرگوں نے پاکستان کے حق میں ووٹ دے کر یقیناً غلطی کی تھی۔ "اگر مسلمانوں کی ایسی مملکت کے قیام کے لئے جہاں وہ اپنی شریعت، اپنی تہذیب اور اپنی ثقافت کے مطابق زندگی گزار سکیں، ووٹ دینا کوئی غلطی ہے تو یقیناً میں نے یہ غلطی کی تھی لیکن یہ ایسی غلطی نہیں جس پر ندامت ہو بلکہ میں تو آج بھی اپنی اس عظیم الشان غلطی کے ارتکاب پر فخر محسوس کرتا ہوں۔" بڑے میاں نے جواب دیا۔ "کیا آپ کو اس کا علم نہیں تھا کہ آپ جس صوبے میں رہتے ہیں وہ پاکستان میں شامل نہیں ہوگا؟" میں نے سوال کیا۔ "مجھے اس کا اچھی طرح علم تھا۔ جبھی تو پاکستان بننے کے بعد ایک دن بھی وہاں نہیں رکا بلکہ پاکستان، اپنے خوابوں کی سرزمین کی جانب ہجرت کی۔" انہوں نے جواب دیا۔ "گویا کہ آپ نے اپنی ضرورت کے تحت ہجرت کی" میں نے کہا۔ "نہیں یہ سراسر بہتان ہے۔ ہجرت تو مسلمانان مکہ نے بھی کی تھی تو کیا انہوں نے اپنی ضرورت کے تحت ایسا کیا تھا؟" انہوں نے سوال کیا۔

"اچھا تو یہ بتائیے کہ جب آپ نے ہجرت کی اور یہاں آئے تو یہاں والوں کا سلوک آپ کے ساتھ کیسا

تھا۔" میں نے پوچھا۔ جب ہم یہاں آئے تو ہمارا کنبہ خاصا بڑا تھا۔ کئی خاندان تھے۔ ہمیں ایک ایسی خالی جگہ رہنے کے لئے میسر آگئی جہاں یہ سارے خاندان اکٹھے رہ سکتے تھے۔ خاصا بڑا کمپاؤنڈ تھا جس پر ہر خاندان نے الگ الگ جھگی ڈال لی۔ شروع شروع میں ہمیں خاصا تنگ ہونا پڑا۔ پہلے چوروں کی آمد کا سلسلہ رہا' بجلی تو تھی نہیں۔ سرشام اندھیرا چھا جاتا تھا۔ لیکن جب ہم نے ان کو کسی واردات کا موقع نہیں دیا اور سچی بات ہے کہ ہم لٹے پٹے لوگوں کے پاس تھا ہی کیا۔ وہ تو ہمیں تنگ کرنا مقصود تھا۔ لیکن ہم وہ تھے جو آگ اور خون کا دریا عبور کر کے یہاں پہنچے تھے۔ ہم بھلا چوروں سے کس طرح مرعوب ہوتے۔ ان کا سلسلہ بند ہوا تو سر شام پتھر برسنے لگے۔ ہم نے بھی جوابی سنگ باری شروع کی تو یہ سلسلہ بھی بند ہوا۔ پھر لوگوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ہم چین سے رہنے لگے۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ ہمیں حکومت کی طرف سے نوٹس ملا کہ یہ جگہ ہم خالی کر دیں کیونکہ اسے پڑوس والے صاحب نے خرید لیا تھا جو حکومت کے کسی محکمے میں اونچے عہدے پر فائز تھے۔ ہم بیدخل کر دیئے گئے۔ پھر ایک دوسری جگہ پناہ لی جو ہندوؤں کا دھرم شالہ تھا۔ (دھرم شالہ غالباً مسافر خانے کو کہتے ہیں) بعد ازاں وہاں سے بھی بے دخل کئے گئے۔ اس دوران ہم معاشی طور پر اتنے مستحکم ہو چکے تھے کہ کرایہ کا مکان لے کر رہ سکتے لیکن اس کا نقصان یہ ہوا کہ ہمارا خاندان شہر کے مختلف علاقوں میں بٹ گیا۔" انہوں نے مفصل جواب دیا۔

"لیکن ہم نے تو سنا ہے کہ مقامی لوگوں نے آپ لوگوں کی بڑی آؤ بھگت کی تھی؟" میں نے پھر سوال کیا۔ "ہاں اچھے لوگوں کی کمی کہیں بھی نہیں ہوتی۔ ان میں بھی تھے لیکن ہمارے ساتھ جو سلوک ہوا وہ ہم نے آپ کو بتا دیا۔" "آپ لوگوں پر الزام ہے کہ آپ نے مقامی لوگوں کے ساتھ کچھ اچھا رویہ اختیار نہیں کیا اور اپنی برتری کا احساس قائم رکھا۔ ملازمتوں پر آپ لوگوں نے قبضہ کئے رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مقامی لوگ معاش کے میدان میں پیچھے رہ گئے۔ اس چیز نے نفرتوں کو جنم دیا"۔ میں نے کہا۔ "دیکھئے بات یہ ہے کہ ہندوستان سے ہجرت کرنے والوں میں بیشتر سرکاری ملازم تھے۔ وہ پاکستان OPT کر کے آئے تھے۔ پاکستان کو پڑھے لکھے لوگوں کی' ہنرمند لوگوں کی اور محنتی لوگوں کی ضرورت تھی۔ ہمیں اگر نوکریاں ملیں تو وہ کسی برسرروزگار بنگالی کو نکال کر نہیں دی گئیں۔ ہم نے حکومت کا انتظام سنبھالا۔ ریلوے کا محکمہ ہو یا پولیس کا یا PIA کا ہر محکمہ میں ہمارے پڑھے لکھے دیانتدار لوگ لئے گئے اور میرٹ کی بنیاد پر لئے گئے۔ سچی بات یہ ہے کہ بنگالی ہم سے کبھی نفرت نہیں کرتے تھے۔ یہ تو مارشل لاء کے دور میں جب فرزند زمین "Son of the Soil" کا کالا قانون نافذ ہوا تو انہیں فائدہ پہنچا اور اس کو بنیاد بنا کر سیاستدانوں نے ہمارے مابین نفرتیں پیدا کیں"۔ بڑے میاں نے جواب دیا۔

"آپ لوگوں پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ آپ نے اپنی شناخت کو ہمیشہ برقرار رکھا اور کبھی بنگالیوں میں ضم ہونے کی کوشش نہیں کی" میں نے پوچھا۔ "آپ یہ بتائیں کہ کیا پنجاب' سرحد اور بلوچستان سے مشرقی پاکستان میں آباد ہونے والوں نے اپنی شناخت ختم کر دی تھی۔ کیا وہ بنگالی جو ہندوستان کے مختلف صوبوں میں مقیم ہیں' انہوں نے اپنی شناخت ختم کر دی ہے۔ یہ تو کبھی نہیں ہوتا' رہی ضم ہونے والی بات تو آج تک دنیا میں کوئی ایسا طریقہ ایجاد نہیں ہوا' جس سے تہذیبیں ایک دو نسل میں ایک دوسرے میں ضم ہو سکیں۔ یہ تو ایک فطری عمل (Natural Prcess) ہے۔ آپ کو شاید یہ معلوم نہیں کہ نارتھ بنگال کے اکثر و بیشتر حصوں میں بسنے والے مہاجروں اور مقامی بنگالیوں میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ آپس میں شادی بیاہ بھی ہوئے۔ ایک دوسرے کی زبانیں بھی سیکھیں لیکن آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ملٹری آپریشن کے نو ماہ کے عرصے میں بنگالیوں کے ہاتھوں مہاجروں کی سب سے زیادہ اموات (Casualty) انہی علاقوں میں ہوئیں۔ کئی ایسی آبادیاں تھیں جو پوری کی پوری صاف کر دی گئیں"۔

"آپ لوگوں پر یہ بھی الزام ہے کہ آپ رہتے مشرقی پاکستان میں تھے اور آپ کی ہمدردیاں مغربی پاکستان کی سیاسی پارٹیوں کے ساتھ تھیں"۔ میں نے سوال کیا۔ "اول تو میں آپ کا ذہن صاف کر دوں۔ ہم مشرقی پاکستان میں ضرور آباد ہوئے تھے لیکن ہجرت ہم نے نہ مشرقی پاکستان کے لئے کی تھی اور نہ مغربی پاکستان کے لئے بلکہ صرف "پاکستان" کے لئے کی تھی۔ اگر ہم نے کسی سیاسی جماعت کا ساتھ دیا تو اسے پاکستان کی سیاسی جماعت سمجھ کر ایسا کیا نہ کہ مشرقی پاکستان یا مغربی پاکستان کی سیاسی جماعت سمجھ کر۔ ہماری ترجیحات دو تھیں۔ اول اسلام' دوم پاکستان۔ لہٰذا مشرقی پاکستان کے مہاجروں نے سب سے زیادہ ساتھ جماعت اسلامی کا دیا۔ آپ ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے نتائج اٹھا کر دیکھ لیں۔ عوامی لیگ کے بعد سب سے زیادہ ووٹ اسی جماعت کو ملے تھے۔ اگر ہم عوامی لیگ کا ساتھ دینا چاہتے تو ہمیں کون روک سکتا تھا لیکن اس صورت میں آج ہمارا شمار بھی پاکستان توڑنے والوں میں ہوتا۔ معمار کبھی اپنا بنایا ہوا گھر نہیں توڑتا۔ ہم نے پاکستان توڑنے کے لئے نہیں بنایا تھا"۔ بڑے میاں کی آواز شدت جذبات سے بھرا گئی تھی۔

"آپ یہ بتائیں کہ ان سب باتوں کے باوجود محصورین بنگلہ دیش پاکستان اب تک کیوں نہیں پہنچ پائے۔" میں نے سوال کیا۔ "اس کا جواب تو آپ ہی بہتر دے سکتے ہیں' ہم تو آج بھی اس دن کے منتظر ہیں جب پاکستان میں نظریہ پاکستان کی حامی کسی جماعت کو اقتدار حاصل ہو اور وہ ہمیں پاکستان منتقل کرنے کا انتظام کرے۔ میں قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں لیکن اس کے باوجود مایوس نہیں' کیونکہ مایوسی کفر ہے"۔ بڑے میاں نے جواب دیا۔ پاکستان میں جو سیاسی صورتحال ہے خصوصاً صوبہ سندھ کے دارالحکومت کراچی میں' اس کی خبریں تو آپ تک یقیناً پہنچ رہی ہوں گی۔ کیا ان سب باتوں کے باوجود بھی آپ پاکستان کا خیال ترک نہیں کریں گے۔ آپ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ وہاں کا خیال ترک کر کے بنگلہ دیش ہی کو اپنا جائے قرار بنا لیں۔ ویسے بھی پاکستان پر معاشی بوجھ بہت زیادہ ہے۔ پھر اس ملک کے اپنے مسائل ہیں۔ آپ ان مسائل میں اضافہ کیوں کرنا چاہتے ہیں جبکہ وہاں کی سیاسی صورتحال اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ کوئی سیاسی جماعت جرات مندانہ اقدام کر کے آپ لوگوں کو مکمل طور پر وہاں بلا لے۔ اگر وہ ایسا کرے تو اسے اقتدار سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ میں کسی خاص سیاسی جماعت کی بات نہیں کر رہا۔ یہ بات تمام جماعتوں کے لئے عام ہے"۔ میں نے پھر سوال کیا۔

"آپ کی باتیں یہ ظاہر کر رہی ہیں کہ ہماری پاکستان منتقلی تقریباً ناممکن العمل ہے۔ میں جب غور کرتا ہوں تو اس کی وجہ مجھے ایک ہی نظر آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ لوگ پاکستان کے مقصد وجود کو فراموش کر بیٹھے ہیں۔ ورنہ ہمیں معاشی بوجھ قرار نہ دیتے۔ دیکھئے یہ تو آپ بھی مانتے ہیں کہ رازق نہ کوئی فرد ہے اور نہ ہی کوئی مملکت۔ آج تو اللہ کا شکر ہے کہ ہم کچھ محنت مزدوری کر کے اپنی روزی کسی قدر کما لیتے ہیں۔ جب سقوط ڈھاکہ ہوا تھا' ہمارے لئے

روزی کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ لیکن اس زمانے میں بھی اس خیر الرازقین نے ہمیں وہ چیزیں کھلائیں جن کا ہم عام دنوں میں تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ گیہوں اگر امریکہ سے آ رہا تھا تو بسکٹ انگلینڈ سے اور دودھ ہالینڈ سے۔ آپ یہ بتائیں کہ جو خوش قسمت یہاں سے پاکستان پہنچ گئے' وہ اس ملک پر کتنے بوجھ ہیں۔ میں تو یہی جانتا ہوں کہ ان میں سے کوئی بھی بھیک نہیں مانگ رہا حالانکہ آپ ہی کے ایک صدر مملکت نے جن کی تہجد گزاری کے بڑے چرچے تھے' ہمیں بھکاری قرار دیا تھا۔ رہی آپ کی دوسری بات تو دیکھئے ہم نے پاکستان بنانے کے لئے جدوجہد کی۔ اس سلسلے میں ہمیں کیا کیا قربانیاں پیش کرنی پڑیں' اس کے تذکرے کی ضرورت نہیں' سب جانتے ہیں۔ بلکہ اب تو پاکستان کے پارلیمنٹ میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ مہاجروں نے کوئی قربانی نہیں دی۔ پھر جب پاکستان کو دفاع کے لئے مشرقی پاکستان کی سرزمین میں لوگ درکار ہوئے تو ہمارے ہی نوجوانوں نے پاک فوج کے قدم سے قدم ملا کر وطن عزیز کا دفاع کیا۔ لیکن افسوس کہ ہمیں محصور پاکستانی کے بجائے لسانی اقلیت قرار دیا گیا۔ ہم نے دوسری بار قربانی دی' وہ بھی دنیا کے سامنے ہے۔ صرف ایک موٹی سی بات سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جس وقت مشرقی پاکستان بنگلہ دیش نہیں بنا تھا' کہا جاتا تھا کہ ہماری آبادی ایک کروڑ کے لگ بھگ ہے جبکہ پورے صوبے کی آبادی آٹھ کروڑ کے لگ بھگ تھی۔ چلیں ایک کروڑ نہ سہی بہت زیادہ کم کریں تو پچاس لاکھ کی آبادی تو ہو گی ہی۔ آج ہم ڈھائی لاکھ کے لگ بھگ بنگلہ دیش میں محصور ہیں' جو لوگ پاکستان پہنچے ان کی تعداد کا آپ کو اچھی طرح علم ہو گا۔ چند ہزار ایسے بھی ہوں گے جو ہندوستان واپس چلے گئے۔ آج اس سوال کا اٹھانے والا کوئی نہیں کہ بقیہ لوگ کہاں چلے گئے' آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی۔ یاد رکھیں آج ہم ڈھائی لاکھ ہیں۔ مرور زمانہ سے ہماری تعداد ڈھائی ہزار کیا ڈھائی سو بھی ہو جائے تو ہم پاکستان پر اپنے حق سے دستبردار نہیں ہوں گے۔ بنگلہ دیش میں آباد ہونے کا سوال ہی کیا۔ ہم نے تو پاکستان بنایا تھا۔ بنگلہ دیش نے تو ہمارے محبوب وطن کے ٹکڑے کروا لے۔ پھر بھی ہم آپ سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ ہم بنگلہ دیشی بن جائیں"۔

بڑے میاں کا جواب سن کر میں اس شخص کی طرف مڑا جو غالباً ان کا بیٹا تھا۔ "کیا میں آپ سے بھی چند سوالات کر سکتا ہوں؟" میں نے اس شخص سے پوچھا۔ کیوں نہیں۔ "ضرور کیجئے" اس نے جواب دینے میں کوئی دیر نہیں کی۔ "ایسا لگتا ہے کہ آپ کی پیدائش پاکستان میں ہوئی"۔ میں نے کہا۔ "جی نہیں یہی تو میرا قصور ہے کہ میں پاکستان میں کیوں پیدا نہیں ہوا۔ میں ہندوستان میں کیوں پیدا ہوا۔ ایسی جگہ جسے میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ والدین کے ساتھ ہجرت کی۔ ۱۹۴۷ء میں میری عمر چار برس کی رہی ہو گی۔" اس نے کہا۔ "آپ تو ماشاء اللہ پڑھے لکھے دکھائی دیتے ہیں"۔ "جی میں گریجویٹ ہوں۔ میں نے شعور کی آنکھیں مشرقی پاکستان میں کھولیں۔ تعلیم کے مراحل یہیں طے کئے اور کبھی یہاں باعزت ملازمت بھی کرتا تھا۔" اس نے کہا۔ "آپ کو تو بنگالی زبان اچھی خاصی آتی ہو گی"۔ "اچھی خاصی تو نہیں البتہ سمجھ لیتا ہوں۔ تھوڑا بہت بول بھی لیتا ہوں۔ دستخط کے لئے بنگلہ میں اپنا نام بھی لکھ سکتا ہوں اور بس"۔ اس نے کہا۔ "لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ جب آپ یہاں پلے بڑھے ہیں' تعلیم بھی حاصل کی اور یہیں اپنی عملی زندگی کا آغاز بھی کیا تو پھر بنگلہ زبان کے معاملے میں آپ کا یہ حال کیوں ہے"؟ میں نے پوچھا۔ "دراصل پرائمری کی سطح پر صرف ایک سال بنگلہ پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ اسکول کالج وغیرہ میں بنگلہ کی پڑھائی لازمی نہیں تھی۔ دفتروں کی زبان انگریزی تھی لہٰذا بنگلہ زبان کے سیکھنے پر توجہ نہ رہی"۔ اس نے جواب دیا۔

"آپ کو بنگلہ دیش میں کیا مسائل درپیش ہیں"۔ ایک دو مسائل ہوں تو بیان کروں۔ سب سے بڑا مسئلہ معاشی ہے۔ بنگلہ زبان پر عبور نہ ہونے اور غیر بنگالی ہونے کے جرم نے ملازمت سے محروم کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم نے حکومت پاکستان کے ساتھ بنگلہ دیش کی جدوجہد آزادی کے دوران تعاون کیا تھا۔ جبھی "collaborator" کہلائے۔ ایسی حالت میں بنگلہ دیش کی حکومت ہمیں ملازمت کس طرح مہیا کر سکتی ہے۔ بچوں کو اردو تعلیم دلوا نہیں سکتے۔ مجھے یقین ہے کہ بنگلہ اسکولوں میں پڑھ کر بھی وہ بنگلہ دیش کے شہری تسلیم نہیں کئے جائیں گے۔ ایک collaborator کے بچے ٹھہریں گے۔ پھر جہاں غربت ہو وہاں جرائم کی طرف رجحان بھی بڑھ جاتا ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے بچے ایسی روش اختیار کریں لہٰذا انہیں محنت مزدوری سے لگا رکھا ہے۔ رہائش کا معیار تو آپ کی نظروں کے سامنے ہے۔ ایسی حالت میں ہم یہاں کس طرح رہ سکتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ وطن کے لئے تمام تر قربانیوں کے باوجود ہمارے ہم وطن ہمیں فراموش کر چکے ہیں"۔ اس نے کہا۔

"لیکن ذرا غیر جانبدار ہو کر سوچیں کہ اگر بالفرض آپ کی منتقلی پاکستان ہو بھی جائے تو بھی آپ کراچی میں ہی رہنا پسند کریں گے۔ سندھ کے شہروں میں پہلے ہی مہاجروں اور دوسرے صوبوں کی اچھی خاصی تعداد آباد ہے۔ بلکہ سندھیوں میں تو یہ احساس پیدا ہونے لگا ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اگر صورتحال یہی رہی تو ان کے اپنے صوبے میں ان کی پوزیشن اقلیت کی ہو جائے گی۔ ان کی حیثیت امریکہ میں رہائش پذیر "ریڈ انڈینز" کی ہو جائے گی۔ پھر وہاں مہاجر قومیت کی آواز بلند ہوئی تو انکے اندیشوں میں اضافہ ہوا۔ اب کراچی صوبہ کی آواز بلند ہو رہی ہے' جس کا مطلب صوبہ سندھ کی تقسیم ہے' کیا سندھی یہ سب کچھ گوارا کر لے گا۔ پھر یہاں سے منتقل ہونے والے بھی مہاجر قومی موومنٹ میں نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں۔ ان سب وجوہات کی بنا پر آپ لوگوں کی منتقلی کی سب سے زیادہ مخالفت صوبہ سندھ میں ہی ہو رہی ہے بلکہ وہ تو آپ کی پاکستان منتقلی ہی کے مخالف ہیں کہ آپ کو پاکستان کے جس صوبے میں بھی آباد کیا جائے گا' آپ سمٹ کر کراچی پہنچ جائیں گے۔ یہاں آپ تقریباً نصف صدی میں بھی بنگالیوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی' بنگلہ زبان کو اختیار نہ کر سکے تو وہاں سندھی کس طرح سیکھیں گے۔ اور جب تک آپ ان کی زبان نہیں سیکھتے' آپ کا وہاں Adjustment کس طرح ممکن ہے؟ کیا آپ کے لئے وہاں وہی دشواریاں نہیں ہوں گی جو یہاں درپیش ہیں"۔ میں نے سوال کیا۔

"یہ درست ہے کہ ہمیں دشواریاں وہاں بھی پیش آئیں گی لیکن اردو کی قومی زبان کی حیثیت کی بنا پر یہ دشواریاں معمولی ہوں گی۔ باقی رہا کراچی میں قیام کا مسئلہ تو ظاہر ہے انسان اپنے ہم زبان لوگوں کے درمیان ہی بہتر طور پر زندگی بسر کر سکتا ہے۔ انگریزی کا وہ مقولہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ "Birds of the same feather fly together" یعنی یکساں پر رکھنے والے پرندے ایک ساتھ محو پرواز ہوتے ہیں۔ ہم چونکہ پاکستان کے حالات سے مکمل طور پر واقف نہیں ہیں لہٰذا ہمیں نہیں معلوم کہ نئے صوبوں کی

(باقی صفحہ ۷ پر)

مغربی تہذیب کے زوال کی کہانی.... مغربی دانشوروں کی زبانی

پہلی قسط

مغرب کی ساری ترقی یک رخی ہے

حافظ محمد سلیمان' ایم اڈ

عالمی قیادت امت مسلمہ کی منتظر ہے بشرطیکہ.....

ایک فارسی شاعر نے کہا ہے۔

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

"مفہوم یہ ہے کہ مزہ جب آتا ہے کہ بات تو ہو ہمارے پیاروں کی مگر کرنے والا کوئی اور ہو۔"

اس دفعہ بات ہمارے پیارے دین اسلام کی ہے اور کرنے والے ہیں برطانیہ کے ولی عہد شہزادہ چارلس' انہوں نے ستمبر ۱۹۹۳ء میں آکسفورڈ کے مرکز برائے مطالعات اسلامی میں "اسلام اور مغرب" کے موضوع پر ایک تقریر کی۔ مخدومی جناب مولانا مجاہد الحسینی صاحب قابل صد مبارکباد ہیں کہ انہوں نے یہ تقریر اپنے موقر رسالہ صوت الاسلام (بابت ماہ دسمبر ۱۹۹۴ء) میں شائع کی اور اس طرح مسلم امہ کے ارباب بصیرت کے لئے غور و فکر کے لئے گویا ایک نیا دریچہ وا کر دیا ہے' جو منظر سامنے آیا ہے اس میں دو چیزیں بڑی روشن' واضح اور بھرپور انداز میں نمایاں ہوئی ہیں انہی کو ان معروضات کا زیب عنوان کیا گیا ہے۔

مغرب کا تہذیبی منظرنامہ

مناسب ہو گا کہ مغربی معاشرہ کی اس صورت حالات کی قدرے وضاحت کر دی جائے جس کے تہذیبی سیاق و سباق میں مذکورہ تقریر کی گئی۔ شروع شروع میں تو کارپردازان تہذیب مغرب یہ سمجھتے رہے کہ دور جدید میں لیلائے تہذیب و ترقی کو راضی کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ مذہب کو ایک قصہ ماضی اور بالخصوص اسلام کو معاذ اللہ دور وحشت کی ایک فرسودہ اور ازکار رفتہ روایت سمجھا جائے لیکن ہوا یہ کہ خدا ناشناس اور غیر انسانی تہذیب حیوانی کے آدمیت سوز شعلوں نے ان کے گھروں کو ویران کر دیا۔ خاندانی نظام کو تباہ کر دیا۔ معاشرے کو انتشار اور لاتعلقی کے حوالے کر دیا۔ افراد کو تنہائی' اجنبیت اور شناخت کے بحران میں مبتلا کر دیا۔ انسانی رشتوں کے تقدس کو ختم کر دیا۔ بوڑھوں کو گھروں سے نکال باہر کر کے محتاج گھروں کے سپرد کر دیا۔ نئی نسل کو منشیات' جرائم' تشدد' ایڈز اور جنسی بے راہ روی کے عذابوں میں گرفتار کر دیا اور نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ اب وہ وقت دور نہیں جب مغرب کی آبادی کی اکثریت بن بیاہی ماؤں کی اولاد ہو گی۔ صرف یہی نہیں ہم جنسی کو قانونی تحفظ دے دیا گیا ہے اور ایسے ننگ انسانیت افراد کے خلاف کسی قسم کی کارروائی کو بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی سمجھا جانے لگا ہے (اور ابھی کچھ عرصہ پہلے تو بی بی سی لندن کے ایسے ملازمین کو جو اپنے کسی ہم جنس کے ساتھ "شادی" کر لیں۔ ہنی مون منانے کے لئے تمام مروجہ مراعات کا اہل قرار دے دیا گیا ہے) ان سب باتوں کا نتیجہ ایک معاشرتی افراتفری اور انارکی کی صورت میں ظاہر ہوا ہے اور مغربی تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرنے کا منظر پیش کر رہی ہے۔

جو کچھ اوپر عرض کیا گیا ہے اس کی حیثیت بظاہر صرف ایک فرد جرم کی ہے مگر یہ محض الزامات نہیں حقائق ہیں اور جب ملزم حقائق کا سامنا کرتا ہے تو اگرچہ "ایک رنگ آتا ہے' ایک رنگ جاتا ہے" لیکن بہرحال ملزم کو مجرم ثابت کرنے کے لئے لازم ہوتا ہے کہ شہادتیں پیش کی جائیں جو کہ پیش خدمت ہیں۔

○ سب سے پہلا شاہد عادل ہمارا قومی ہیرو عمران خان ہے' جس نے زندگی اور جوانی کا بڑا حصہ مغرب میں گزارا ہے۔ اس طرح سے وہ ایک عینی اور موقعے کا گواہ ہے۔ اس کا کہنا ہے "آپ یقین کریں اب ان (مغربی) لوگوں کا ڈاؤن فال (زوال) ہو رہا ہے۔ ننگا پن ان کی ترقی نہیں ہے۔ ان لوگوں کے فیملی سسٹم ٹوٹ چکے ہیں' وہاں پر فی صد طلاقوں کی ریشو (شرح) بڑھ رہی ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارا یوتھ (نوجوان) یہ تصور کئے بیٹھا ہے کہ شاید اس ننگے پن میں ترقی ہے۔ اس سوچ کو بدلنا ہو گا"۔

○ مغرب کے نامور عالم اور محقق پروفیسر سارو کن کہتے ہیں "مغرب کا چھ صد سالہ سائنسی دن اب ختم ہونے کے قریب ہے۔ یہ تہذیب جو آزادی فکر اور وقار انسانیت کے نام پر اٹھی تھی مادیت کی دلدل میں پڑ کر اپنا سب کچھ کھو بیٹھی ہے۔ اب اس کی مردہ لاش تعفن پھیلا رہی ہے۔ اسے جس قدر جلد دفن کر دیا جائے بہتر ہے"۔

○ ایک تو ہوتی ہے جگ بیتی اور ایک ہوتی ہے آپ بیتی' شاعر کہتا ہے۔

لطف ہے کون سی کہانی میں
آپ بیتی کہوں کہ جگ بیتی

اب جو تحریر آپ پڑھیں گے وہ گویا آپ بیتی ہے اور بیان کرنے والی ہیں' نو مسلمہ سسٹر امینہ' ایک امریکی خاتون جو ۱۹۷۷ء میں اسلام قبول کرنے سے پہلے امریکہ کے سنڈے سکولوں میں عیسائیت کی تعلیم دیا کرتی تھی آپ فرماتی ہیں:

"آج یورپ میں عورت سے زیادہ کوئی مظلوم نہیں' وہ فحاشی اور عدم تحفظ کے گہرے گڑھے میں گر گئی ہے اور جو کچھ اس کے پاس تھا' وہ بھی کھو دیا ہے۔ آج عالم یہ ہے کہ گھر کو قید خانہ سمجھ کر دفتروں کی زندگی اپنانے کے نتیجے میں اسے صبح ہی صبح تیزی کے ساتھ گاڑیوں کا تعاقب کرنا پڑتا ہے اور ٹریفک کے بے پناہ رش میں دو دو گھنٹے کی بھاگ دوڑ کے بعد اپنے دفتر پہنچتی ہے۔ وہاں دن بھر نوکرانی کی طرح کام بھی کرتی اور اپنے باس (Boss) کے اشارۂ ابرو پر ہر طرح کا ناگوار کام بھی کرتی ہے۔ شام کو دوبارہ ٹریفک کے سیلاب کا مقابلہ کر کے گھر آتی ہے تو تھکاوٹ سے اس قدر نڈھال اور زندگی سے اتنی بیزار ہوتی ہے کہ اپنے ننھے پیارے بچے کی بات کا جواب تک نہیں دے سکتی۔ امریکی خواتین کے بچے ڈے کیئر سنٹروں میں پلتے ہیں' جہاں وہ عدم توجہ کا شکار رہتے اور نفسیاتی مریض بن جاتے ہیں۔ وہاں انہیں سادھو ازم اور

جادوگری کا زہر پلایا جاتا ہے۔ ان پر مجرمانہ حملے ہوتے ہیں اور والدین کی شفقت اور خاندانی نظام سے محروم ہو کر وہ بچپن ہی میں منشیات کے عادی ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ بے شمار بچے نو دس سال کی عمر میں خودکشی تک کر لیتے ہیں اور پبلک سکولوں میں فیل ہونے والے بچوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ایڈز اور ہم جنسی عام ہے اور امریکہ کی بعض ریاستوں میں تو ہم جنسی کو قانونی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ بڑھاپے میں والدین شدید کسمپرسی کی زندگی گزارتے ہیں اور جونہی ایک خاتون کی عمر ۳۵ سال سے تجاوز کرتی ہے اسے اس طرح نظر انداز کیا جاتا ہے کہ وہ زندہ درگور ہو کر نفسیاتی مریض بن جاتی ہے۔ چنانچہ امریکہ میں ذہنی امراض کے ہسپتال مریضوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ غرض وہاں نہ عورتوں کو سکون حاصل ہے' نہ بچوں کو' نہ بوڑھوں کو' پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ پاکستانی خواتین اور مرد حضرات اس معاشرے کو آئیڈیل کیوں سمجھتے ہیں اور وہی اطوار کیوں اختیار کر رہے ہیں جنہوں نے امریکی اور یورپی سماج کو تباہ و برباد کر دیا ہے"۔ (دنیا کے ۸۵ نو مسلموں کی سرگزشت ہم کیوں مسلمان ہوئے مولف ڈاکٹر عبدالغنی فاروق' صفحہ ۵۴'۵۵)

اقتباس آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ قابل غور بات یہ ہے کہ ایک مغربی خاتون یہ فرما رہی ہیں کہ آج یورپ میں عورت سے زیادہ مظلوم کوئی نہیں۔ یہ بات ان لوگوں کے لئے سرمہ چشم بصیرت ہونا چاہئے جو اپنی جہالت کی بناء پر مکروہ پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ "اسلامی معاشرہ میں عورت آدھی ہے" حقوق نسواں اور آزادی خواتین کا چیمپئن اگر کوئی ہے تو مغرب ہے اور اس لئے ہماری معزز خواتین کو آنکھیں بند کر کے فحاشی و عریانی اور بے حیائی کے اس اندھے' متعفن اور بدبو دار کنویں میں گر جانا چاہئے جہاں ان کی مغربی بہنیں سسک رہی ہیں' کراہ رہی ہیں اور ان لوگوں کی جان کو رو رہی ہیں' جو اس جنسی طرز زندگی کو برپا کرنے کے ذمہ دار ہیں"۔

اسلامی تعلیمات کی جامعیت اور ہمہ گیری

ہم نے قدرے تفصیل کے ساتھ مغرب کا تہذیبی منظر نامہ پیش کیا ہے تاکہ اصل اور سنگین حقائق سامنے لائے جا سکیں اور اس سیاق و سباق کا بخوبی علم ہو سکے' جس میں شہزادہ چارلس کی مذکورہ تقریر کو دیکھنا اس کی بہتر تفہیم کے لئے ضروری ہو گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بالآخر مچھلی پتھر چاٹ کر واپس آ رہی ہے۔ انسانیت نے بدنصیبی کے اتنے دھکے کھائے ہیں اور نااہلوں کے ہاتھوں وہ اتنی زیادہ بیمار ہوئی ہے کہ اب وہ اسلامی تعلیمات کی "آغوش مادر" میں آنے کے لئے بے قرار ہے۔ پیر رومیؒ نے شاید کسی ایسی ہی صورت حالات کی پیش بینی کر کے فرمایا تھا۔

دست ہر نااہل بیمارت کند
سوئے مادر آ کہ تیمارت کند

تہذیب مغرب کی اصل بیماری کی بالکل صحیح تشخیص کرتے ہوئے شہزادہ چارلس اپنی مذکورہ تقریر میں فرماتے ہیں۔

"مغرب کی ساری ترقی یک رخی ہے... ہم زندگی کے مادی اور روحانی پہلوؤں میں جو توازن کھو چکے ہیں وہ ہمیں دوبارہ حاصل کرنا ہے۔ یہ نہ ہوا تو ہم تباہی تک پہنچ جائیں گے۔"

یہاں پر یہ ذکر کرنا بالکل برمحل ہو گا کہ بیسویں صدی کے عظیم ترین مورخ آرنلڈ ٹائن بی نے بھی مغرب کی ناکامی کی اصل وجہ یہی قرار دی ہے کہ وہ زندگی کی روحانی صداقتوں کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہو سکا۔ آپ فرماتے ہیں :

"آدمی روٹی کھاتا ہے وہ ایک معاشرتی حیوان ہے لیکن وہ اس کے علاوہ بھی کچھ اور ہے۔ اس کے اندر ایک قوت ارادی ہے' ضمیر ہے اور خود آگاہی کا ادراک ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ روحانی صداقتوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر رہے۔ یہی اصل مرکز ہے۔ سائنس اور دوسرے معاشرتی نصب العین یہاں ناکام ہو جاتے ہیں۔ اعلیٰ مذاہب ہی روح کے حقیقی مسئلے کو تسلیم کرتے اور انسان کی رہنمائی کرتے ہیں۔ سائنس یہاں ناکام رہتی ہے۔ سائنس کی اس ناکامی میں مغرب کی ناکامی پوشیدہ ہے"۔ (جمیل جالبی کی کتاب تنقید اور تجربہ صفحہ ۳۵)

اہل نظر سے مخفی نہیں کہ زندگی میں انسانی سطح پر اصل مسئلہ ساز ہستی کی ہم آہنگی کا ہے۔ بیسویں صدی کا عظیم ترین سائنس دان آئن سٹائن اس ہم آہنگی کی دوگونہ نوعیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے "اندرونی ہم آہنگی اور معاشرتی توافق" کا نام دیتا ہے۔ شہزادہ چارلس اس کو "زندگی کے مادی اور روحانی پہلوؤں میں توازن" کہتے ہیں۔ فاضل مورخ ٹائن بی بالکل صحیح فرماتے ہیں کہ تمام اعلیٰ مذاہب روح کے حقیقی مسئلے کو تسلیم کرتے اور انسان کی رہنمائی کرتے ہیں مگر بدقسمتی سے اسلام کے علاوہ باقی اعلیٰ مذاہب کی یہ رہنمائی تہذیب مغربی ہی کی طرح' اگرچہ اس کے بالکل مخالف سمت 'یک رخی ہے' ہمیں خوشی ہے کہ شہزادہ چارلس کو اس حقیقت کا بڑا واضح شعور ہے کہ اس سلسلہ میں مکمل رہنمائی صرف اس دین کے پاس ہے' جس کے متعلق "الیوم اکملت لکم دینکم" یعنی "آج میں نے تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا" (المائدہ : ۳) فرمایا گیا اور جسے دین قیم کہا گیا کہ یہی وہ دین ہے جو "فطرہ اللہ التی فطر الناس علیھا" یعنی "اللہ کی وہ فطرت جس پر اس نے انسانوں کی تخلیق کی" (الروم : ۳۰) کے عین مطابق ہے۔ چنانچہ شہزادہ موصوف فرماتے ہیں "اس دنیا میں مل جل کر رہنے کے لئے اسلام کے دامن میں وہ کچھ ہے جو اب عیسائیت کے پاس نہیں ہے۔ اسلام کا کائنات اور انسان کا تصور ایک جامع اور ہمہ گیر تصور ہے جو زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتا ہے۔ اسلام میں پوری زندگی ایک اکائی ہے"۔

اسلام کس طرح زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتا ہے اس کی نہایت خوبصورت عکاسی جناب علی عزت بیگووچ صدر جمہوریہ بوسنیا و ہرزیگوینا اپنی فاضلانہ تصنیف "اسلام اور مشرق و مغرب کی تہذیبی کشمکش' مترجم جناب محمد ایوب منیر" میں اسلام کی بنیادی عبادت نماز کے حوالے سے یوں کرتے ہیں :

بقیہ : اداریہ

صنعت کاروں تاجروں کے لئے اپنے مخصوص کاروباری مفادات کے تحفظ کی غرض سے حکومت میں عمل دخل ضروری ہو گیا تھا۔ دونوں میں سے جو حزب اقتدار میں ہوں ان کی پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں ہوتا ہی ہے' جنہیں حزب اختلاف میں رہنے کی مجبوری لاحق ہو جائے وہ سیاسی انتقام کے الزام سے ڈھال کا کام لیتے ہیں۔ ہم پورے یقین و اذعان کے ساتھ دعویٰ کرتے ہیں کہ جاگیرداری کے خاتمے کے علاوہ اس قوم کو اگر اہل غرض "جز وقتی" سیاست دانوں کے بجائے بے غرض "ہمہ وقتی" اہل سیاست میسر نہ آئے تو موجودہ سیاسی نظام کا ڈھانچہ زمین بوس ہو کر رہے گا چاہے وہ پارلیمانی طرز کا ہو چاہے صدارتی۔ جاگیرداروں اور چرنے چگنے والے جز وقتی سیاست دانوں نے اس ملک خداداد کو بہت دنوں اپنی چراگاہ بنائے رکھا ہے۔ کیا ہمیں اس دن کا انتظار ہے جب یہاں سبز گھاس کا ایک تنکا بھی کھڑا نظر نہ آئے گا؟۔OO

مذہب کے لئے ذوق و شوق کا یہ عالم اور دین سے ایسی لاتعلقی!

"اتاترک" کا "اصیل" بیٹا ہم پر یوں جھپٹا کہ.....

اب تک کے آخری "دار الخلافہ" میں ایک عرصہ کے بعد ہم نے خلافت کی اذان دی

اقتدار احمد

بُرصہ کی شاندار مسجدِ اکبر (اُلو جامع) سے واپسی پر خیالات کا تانا بانا بار بار الجھتا رہا۔ استنبول میں ہمیں نظر آنے والے جن ترکوں نے بقول میر تقی میرؔ یہ روش اپنا لی ہے کہ "قشقہ کھینچا، دَیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا" ان سے تو گلہ ہی نہیں، رونا اپنے ان پکے سُنّی ترک بھائیوں پر آتا تھا جو مذہبی شعائر کا تو اتاترک کے کمالِ ستم کے باوجود اور کئی عشرے ترکِ اسلام پر قانوناً مجبور رکھے جانے کے باوصف ایسا حیران کن ذوق و شوق رکھتے ہیں لیکن دین کے حرکی اور انقلابی تصور سے بالکل ہی نابلد ہو کر رہ گئے۔ دراصل ماوراء النہر یعنی افغانستان سے اوپر اوپر وسطی اور شمال مغربی ایشیا کے پورے علاقے میں تبلیغ و اشاعتِ اسلام کا کام خلافت راشدہ کے بابرکت دور کے خاتمے پر صوفیاء نے ہی سنبھالا تھا۔ خلافتِ فاروقی و عثمانی میں اللہ کا دین ایک سیلاب کی طرح اس پورے علاقے میں پھر گیا اور واقعہ یہ ہے کہ "رکتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا"۔ پھر جب رکا تو اس پر خلافتِ علوی کے زمانے میں سبائی سازشوں اور بدترین خانہ جنگی نے ہی بند باندھا تھا۔ شمشیر و سناں اور جہاد و قتال فی سبیل اللہ والے دین کی یلغار رک گئی تو تسبیح و سجادہ و دلق نے آ کر اسلام کو سہارا دیا ورنہ کیا عجب یہاں ارتداد کی کوئی شکل اسلام کو پسپائی پر ہی مجبور کر دیتی۔ یعنی "ایں ہم غنیمت است" لیکن وقت کے تیور پہچاننے میں میرے یہ بھائی اور کتنا وقت لیں گے؟۔

یوں تو عربی اسلام برصغیر پاک و ہند کے دروازے پر بھی محض دستک دے کر ہی لوٹ گیا تھا اور بعد ازاں ہندوستان کو اپنا دیس بنانے کے لئے اسلام کا عجمی ایڈیشن ماوراء النہر کے راستے ہی صوفیاء کی انگلی پکڑے آیا اور ہم صنم خانۂ ہند کے سومناتیوں کی تقدیریں انہی خرقہ پوش مردانِ مومن کی نگاہوں سے بدلی ہیں لیکن گزشتہ چار صدیوں میں ہم پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل ہوا کہ یکے بعد دیگرے مجددینِ امت نے اسی سرزمین کو اپنی محنت اور توجہ کا ہدف بنایا اور مجدد الف ثانیؒ سے شروع ہونے والا یہ سلسلۃ الذہب بظاہر اگر ٹوٹ گیا ہو تب بھی اس کے معنوی تسلسل میں خلل نہیں پڑا۔ امت کے حدی خواں اقبالؔ ہی کو لے لیجئے، آبِ روانِ کبیر کے کنارے دیکھے ہوئے ان کے خواب کیا پورے ہوتے نظر نہیں آ رہے؟۔ میں سوچتا رہا کہ ترک مسلمان ہم ہندیوں کے مقابلے میں یقیناً بہت زیادہ جری اور باہمت جوان تھے، ستاروں پر کمندیں ڈال سکتے تھے تو آخر اللہ میاں کی اس میں کیا حکمت ہے جو اس پورے علاقے کا دامن تجدید و احیائے دین کی مساعی سے تقریباً تہی رکھا گیا؟۔ یہاں ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا چاک کر دی تو پورا ہندوستان "بولیں اماں محمد علی کی، جان بیٹا خلافت پہ دے دو" کے رزم سے گونج اٹھا تھا۔ یہاں جن دنوں آزاد و خود مختار "موزلم" سیکولر ریاست میں سجدے پر قدغن تھی انہی دنوں سرکار انگلشیہ کے وفادار و دعاگو پیران و شیوخ اور سجادہ نشینوں کو برصغیر میں ایک برہمن زادہ آڑے ہاتھوں لے رہا تھا۔

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اور خود ہم جو "فقیرانہ آئے، صدا کر چلے۔ میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے" یہاں کس غرض سے آئے تھے۔ دنیا میں اب تک کے آخری "دار الخلافہ" استنبول میں خلافت کی اذان دینے جہاں یہ لفظ شاید لغت سے ہی خارج ہو چکا ہے !۔ اللہ تعالیٰ کی سنت اور اس کا قانونِ مکافات بھی غیر متبدل ہے، انسانوں کے گروہ اسی کی کسی دفعہ یا شق کی لپیٹ میں آتے ہیں۔ ہمارے ترک بھائی کس جرم کی پاداش میں ماخوذ ہیں ؟۔ اللہ کی اللہ ہی جانے !۔

اندر ہی اندر اسی ادھیڑ بن میں مصروف لیکن ساتھ ساتھ "ٹیبل ٹاک" کے تقاضے بھی نبھاتے ہم سیڑھیاں اتر کر اب ایک صاف ستھرے ریستوران میں ایک میز کا گھیراؤ کئے بیٹھے تھے جو ماضی کے مسجد کمپلیکس ہی کے زیریں حصے میں بارونق بازار کی شکل اختیار کر لینے والی عمارات میں واقع ہے۔ یہاں خوب رغبت سے پیٹ بھر کر جو کھانا ہم نے کھایا، وہ ذائقے میں تو ہرگز کم نہ تھا لیکن شکل و صورت یعنی ٹیپ ٹاپ میں استنبول کے ماکولات سے اس کی کُٹّی دبتی رہی۔ اسے آپ شہر اور قصبے کا فرق بھی کہہ سکتے ہیں۔ سفر کی تکان پر جونہی وافر و لذیذ غذا کے خمار کا اضافہ ہوا، ہماری رگِ سیاحت نے پھڑکنا چھوڑ دیا۔ یہی جی میں آئی کہ یہاں سے نکل کر اب واپسی کے لئے بس کے اڈے ہی کی راہ لی جائے۔ سوچا تھا کہ ترکانِ عثمانی کے جد امجد اور بعد میں پانچ صدیوں تک خلافتِ عثمانیہ قرار دی جانے والی سلطنتِ عثمانیہ کے بانی اور اناطولیہ کے پہلے حکمران، سلطان عثمان کی قبر دیکھی جائے جو یہیں ان کے دار الحکومت کے ایک بازنطینی کلیسا میں محفوظ ہے اور اس پروگرام کا سب سے زیادہ پرجوش حامی مجھے ہونا چاہئے تھے جس پر سیاحت کا بھوت سوار رہتا ہے لیکن مقبروں کے معاملے میں اپنی کیفیت بھی جگرؔ کی طرح منفرد ہے۔

ہجر میں شاد ' وصل میں ناشاد
کیا طبیعت جگر نے پائی ہے

مدینہ المنورہ میں روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حاضری کا معاملہ تو بالکل مختلف نوعیت کا ہے اور اس پر زبان کھولنے کی ہمت بھی نہیں رکھتا کہ مسئلہ بہت نازک بھی ہے۔ وہاں تو سر کے بل چل کر جاتا ہوں اور مواجہ شریف میں سلام کے لئے کھڑے ہوئے میری وہابیت کو بھی دانتوں پسینہ آتا ہے لیکن اس کے سوا قبروں سے میرا تعلق بس اتنا ہی ہے کہ ہمیشہ اور ہر جگہ کسی بھی قبرستان سے گزرتے ہوئے اہل القبور کو مسنون انداز میں دعائیہ سلام التزام کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔ والدین' خوشدامن' ایک بہن اور بہنوئی' ایک جوان داماد اور ایک نوجوان بیٹا آس پاس ہی مدفون ہیں لیکن کسی اور کی تدفین کے لئے ادھر کا رخ کرنا پڑے تو وہاں موجود اپنے عزیز کی قبر پر بھی فاتحہ پڑھ لیتا ہوں ورنہ باقاعدہ وبالضابطہ زیارتِ قبور میرے معمولات سے خارج ہے۔ اپنے پیاروں کے ئے بلاناغہ نام بنام فجر کی فرض نماز سے پہلے دعائے مغفرت تو الحمدللہ سفر و حضر میں بھی نہیں بھولتا لیکن ان کی ذات کا جو حصہ ہم زمین کے سپرد کر آئے' وہ میرے نزدیک کسی اہمیت' تقدس یا احترام کا مستحق نہیں۔ آپ کبھی پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں کہ وہ بال جو آپ کے جسم کا حصہ تھے' تراش کر حجام نے کہاں پھینکے؟۔ میرے نزدیک انسان کی اصل شخصیت اس میں موجود وہ روح ربانی ہے جو جسم پر موت کے طاری ہوتے ہی اپنی "اصل" کی طرف پرواز کر جاتی ہے اور پھر وہ حشر کے دن تک کہاں رہے گی؟۔ عالم برزخ کی حقیقت کیا ہے اور روحوں کو ایک طویل عرصہ انتظار میں وہاں رہتے کن کیفیات سے دوچار ہونا ہے وغیرہ ایسے سوالات ہیں جن کے جوابات کی تلاش میں سر کھپانا عبث کام ہے اور ہمیں اس سے روکا بھی گیا ہے۔

گمال عبد الناصر (میں جمال کیوں لکھوں جب خود مصری "ج" کو "گ" بولتے ہیں) کے مرحوم ہونے کے بعد متعدد بار قاہرہ جانا ہوا لیکن ایک دفعہ بھی ان کی قبر پر جانے کو جی نہ چاہا۔ ماضی میں جب آتش جوان تھا' جمال عبد الناصر میرا بھی ہیرو تھا لیکن دو باتوں نے کچھ کم اور دو نے ان سے بہت زیادہ متنفر کر دیا۔ کم تر تو اخوان المسلمون پر ناصر کے مظالم اور (قاری) الشیخ عبد الباسط عبد الصمد اور (مغنیہ) ام کلثوم کو یکساں "فنکار" کی حیثیت میں برابر کا قومی اثاثہ قرار دینے پر اور زیادہ ان کے نعرے "نحن ابناء الفراعنۃ" (یعنی ہم فرعون کے بیٹے' ان کی عظمت کے امین ہیں) اور جون ۱۹۶۷ء میں اسرائیل کو پیٹھ دکھانے پر۔ اس کے برعکس انور السادات کے لئے کیمپ ڈیوڈ معاہدے کے باوجود بھی محبت کے جذبات موجزن رہے تو صرف اس لئے کہ اکتوبر ۷۳ء کی جنگ کے بعد قاہرہ سے گزر ہوا تو وہاں اس کے بارے میں جابجا چسپاں پوسٹر لگے دیکھے تھے جن میں تصاویر کے ذریعے سنگ و آہن سے بنی اسرائیل کے نزدیک ناقابل تسخیر "بارلیو لائن" میں ڈالے گئے' شگافوں کو اور مصری فوجوں کے بے جگری کے ساتھ نہر سویز عبور کرنے کو دکھایا گیا تھا۔

مجھے شیر دل انور السادات کے دوسرے سب قومی و دینی جرائم اس کارنامے کے طفیل قابل معافی لگتے ہیں۔ اکتوبر ۷۳ء میں ایک نیا پراجیکٹ شروع کرتے ہوئے میں بے سروسامانی کے عالم میں پشاور کے قریب ایک چٹیل میدان میں خیمہ زن تھا۔ ٹرانسسٹر ریڈیو پر مصری عساکر کی کامیابی کی خبر سن کر میں نے ایک دنبہ ذبح کیا اور پلاؤ کی دیگ پکوا کر آس پاس کے لوگوں کے ساتھ جشن منایا تھا۔ ۱۹۹۱ء میں آخری دفعہ ایک شام قاہرہ میں گھوم رہا تھا کہ انور السادات کے مقبرے کے پاس سے گزرا۔ قدم خودبخود اس کی طرف بڑھنے لگے۔ قریب پہنچ کر میں نے درمیانی سی آواز میں "السلام علیک یا اہل القبر --- الی آخر" کہا تو میری زبان سے نکلنے والے اولین الفاظ پر ہی وہ عسکری جو بندوق تھامے پہرے پر کھڑا تھا' بول پڑا۔ "وعلیکم السلام"۔ شاید اس مسنون انداز تخاطب کا وہاں رواج نہیں رہا اور اس جندی (سپاہی) کو اندازہ بھی نہ ہو گا کہ یہ اجنبی مقامی رسم و رواج سے بھی واقف ہے۔ میں انور السادات پر سلامتی بھیجنے کے بعد اسے بھی "مساء الخیر" (گڈ ایوننگ) کہنے والا تھا جس کے جواب میں وہ "مساء النور" (روشن شام) کہتا لیکن میرے بھائی نے اس کا موقع ہی نہ دیا۔ ہمارے ہاں سلام کا جو ٹھیٹھ اسلامی طریقہ آج تک رائج ہے' وہ دیارِ عرب میں اب کم ہی نظر آتا ہے۔

ایک پیلی ٹیکسی پکڑ کر ہم واپس بس ٹرمینل پہنچے اور بس اسی آمد و رفت میں ہم نے برصہ کی جھلکیاں دیکھی ہیں جو میرے نزدیک اصل ترکی کی نمائندگی کرتا ہے۔ استنبول کے یورپی حصے سے لے کر گرد علاقے سے ملحق ترکی کے جنوب مشرقی کونے تک پھیلی ہوئی آبادی کے رنگ ڈھنگ کی اوسط نکالی جائے تو وہی بنے گی جسے ہم نے برصہ میں دیکھا اور محسوس کیا۔ ترکی

ایک عام ترک بوڑھا اپنے روایتی لباس میں۔ دبیز مخمل کی ٹوپی' انگریزی کوٹ' نیچے موٹے کپڑے سے بنا ہوا شلوار اور پتلون کے درمیان کا سا پہناوا اور جراب کے ساتھ بند بوٹ۔ ترکی میں شرح خواندگی پاکستان کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے

کے بعض علاقوں میں "ک" کی آواز "چ" میں بدل جاتی ہے اور برصہ میں جہاں اکثریت ہمارے ملک کو پاکستان اور خود کو ترک کہتی سنائی دی' وہیں میرے کانوں میں کچھ لوگوں کی تکبیر تحریمہ "اللہ اچبر" کی شکل میں بھی پڑی۔ بسوں کے اڈے پر نئی نویلی ایرکنڈیشنڈ یورپی بسیں مختلف سمتوں میں جانے کے لئے تیار کھڑی تھیں۔ ہم نے اس روٹ کا انتخاب کیا جس پر ہمیں بحر مرمرہ کو اپنی بس سمیت فیری سروس کے ذریعے عبور کر کے اسی میں استنبول پہنچنا تھا۔ عزیزے کھڑکی کے سامنے قطار میں لگ کر چار ٹکٹ خرید لایا اور ہم یہ دیکھے بغیر کہ ان پر سیٹ نمبر بھی درج ہیں بس میں داخل ہو کر ڈرائیور کے عقب میں پہلی چار نشستوں پر جا بیٹھے جہاں سے سامنے کا منظر بہت کھلا ملتا۔ یورپی بسوں کے اندر فرش دو سطحوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ مسافروں والے حصے کی سطح بلند ہوتی ہے کیونکہ اس کے نیچے پوری چوڑائی میں سامان رکھنے کے مقفل خانے بنائے جاتے ہیں۔ ہم نے جو سیٹیں سنبھالی تھیں' ڈرائیور کی نشست اس سے خاصی نیچی تھی اور سامنے کی ونڈ سکرین اتنی بلند کہ

بیٹھے بیٹھے ہم سڑک اور آسمان کو بیک وقت دیکھ سکتے تھے۔

اچانک ایک صاحب بہادر قسم کے ادھیڑ عمر ترک بس میں چڑھ کر ہم پر جھپٹے۔ ان کی بات تو پلے نہ پڑی لیکن حرکات و سکنات اور جہنم دہاڑ سے لگتا تھا کہ ہمیں اٹھا کر باہر پھینک دیں گے۔ عزمے نے بتایا کہ ہم ان کے گروپ کی نشستوں پر قابض ہیں اور خود ان سے ہماری سفارش کی کہ پاکستانی بھائی ہیں' ایسی بھی کیا بات ہے' آپ ان کی سیٹوں پر بیٹھ جائیں لیکن ان کی آنکھوں میں اترا ہوا خون بدستور کھولتا رہا اور ہم نے عافیت اسی میں جانی کہ خاموشی سے اپنا ناجائز قبضہ چھوڑ دیں۔ یہ صاحب ٹائی اور فلیٹ سمیت پورے مغربی لباس میں تھے اور مجھے اپنے بابائے قوم (اتاترک) کے "خلف الرشید" لگے۔ خاص طور پر محسوس ہوا کہ ان پہ ہماری داڑھیاں بہت ناگوار گزری ہیں۔ واللہ اعلم۔ ہمیں اپنے ترک بھائیوں کا یہ رنگ بھی دیکھنا تھا سو دیکھ لیا۔

بس روانہ ہوئی تو راستے میں زیر تعمیر مسجد کا منظر ایک اور زاویئے سے سامنے آیا۔ وہاں شہروں میں اکثر سڑکیں یک طرفہ ٹریفک کے لئے استعمال ہوتی ہیں لہٰذا آتے ہوئے اسی مسجد کا دوسرا پہلو دیکھا تھا۔ گنبد کا ڈیزائن ہو بہو وہی جس سے اب تک ہماری نظریں پوری طرح شناسا ہو چکی تھیں' فرق صرف یہ کہ پرانی مساجد میں پتھر استعمال ہوا تھا اور اب یہ کام فولادی کنکریٹ (آر سی سی) میں کیا جاتا ہے۔ دو اطراف سے دیکھ کر اس کی بہت سی تعمیری تفاصیل سامنے آئیں۔ اس سلسلہ مضامین میں پہلے کہیں ذکر کر چکا ہوں کہ ترکی کی تاریخی مساجد کے طرز تعمیر پر بھی ضرور کچھ لکھوں گا کہ اس موضوع سے مجھے پیشہ ورانہ مناسبت بھی ہے۔ اب برصہ کی زیر تعمیر مسجد کے شاندار گنبد کی بات بھی آ ہی گئی ہے تو سلطنت عثمانی کے ماہر تعمیر "سنان" کا تعارف نہ کرانا بڑا ظلم ہو گا۔ اگلی قسط اس کے نام' ورنہ اسی مرتبہ ترکی کے سفر کی روداد کو "تمت بالخیر" پر ختم کرنے کا ارادہ تھا۔

واپسی کے راستے کا پہلا حصہ تو وہی تھا جو آتے ہوئے طے کیا' پھر ہماری بس ایک نئے راستے پر ہولی۔ یہاں شاہراہ کے دونوں جانب کھیت کھلیان نہیں بلکہ چھوٹی بڑی صنعتی عمارات اور کشادہ مال گودام تھے۔ مجھے خوب اندازہ ہے کہ ترکی ہمارے مقابلے میں خاصا ہی ترقی یافتہ ملک ہے۔ یورپ کے قرب سے فائدہ اٹھانے کے علاوہ جرمنی جیسی جاندار اور بام عروج پر پہنچی ہوئی قوم سے ترکوں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ خلافت عثمانیہ کے زمانے سے ہٹلر کے جرمنی کے ساتھ سیاسی اور فوجی مراسم تھے۔ مشرقی جرمنی کے ساتھ آ ملنے سے مغربی جرمنی کی اب وہ بات نہیں رہی جو جنگ عظیم دوم کے بعد سے دیوار برلن کے ٹوٹنے تک تھی اور ترکوں کی بہت بڑی تعداد مغربی جرمنی میں ہی کام کرتی ہے جیسے خلیج کے ممالک میں پاکستانی ہر شعبہ زندگی میں مصروف کار ہیں اور زر مبادلہ کمانے کے علاوہ بہت کچھ سیکھ سمجھ کر آتے ہیں۔ اس کے باوجود ترکی میں افراط زر خطرناک حد تک زیادہ ہے تو اس کی وجہ کا تعین میرے بس میں نہیں' کوئی ماہر معاشیات ہی درست تجزیہ کر سکتا ہے۔

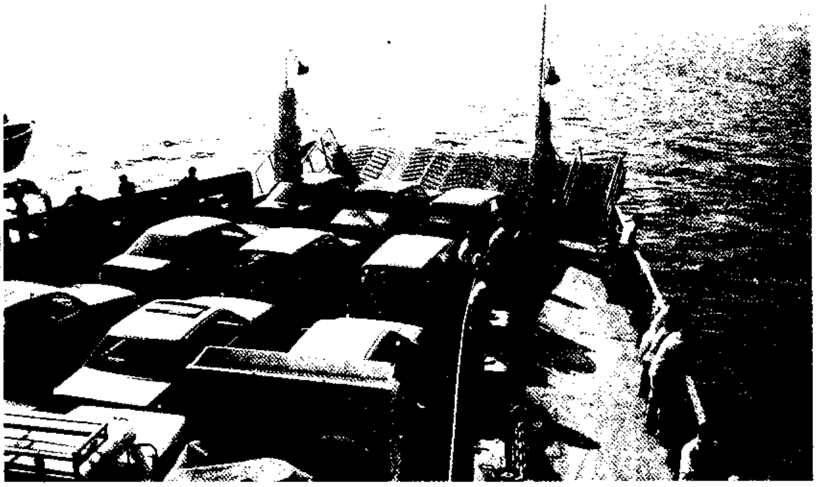

فیری سروس کے جہاز کے اگلے حصے کا منظر

یہ شاہراہ بحر مرمرہ کی ایک منی بندرگاہ پر اختتام پذیر ہوئی جس پر ایک مخصوص قسم کا جہاز ہمارا منتظر تھا جو فیری سروس کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ درمیانے سائز کا اور درمیانی ہی رفتار سے چلنے والا یہ جہاز سامنے اور پیچھے سے یکساں چوڑا ہوتا ہے اور ریل کے انجن کی طرح سیدھا یا الٹا یکساں انداز میں چل سکتا ہے۔ اس کے ڈیک سے دونوں جانب ایک ریمپ نکل کر ساحل پر ایک مخصوص کھانچے میں چول کی طرح بیٹھ جاتا ہے اور کاریں' بسیں' ٹرک جیسی سب گاڑیاں سواریوں اور سامان سمیت اپنے پیروں چل کر اس ریمپ پر سے گزرتے ہوئے جہاز کی چوڑائی میں قاعدے قرینے سے پارک ہوتی چلی جاتی ہیں۔ مسافر کچھ تو گاڑیوں میں اپنی نشستوں پر پھیل کر بیٹھے رہتے ہیں اور کچھ اتر کر جہاز کی اوپر والی منزل پر جا پہنچتے ہیں جہاں بیٹھنے کے لئے بنچ' گھوم پھر کے ہوا کھانے اور سمندر کی سیر کے لئے چاروں طرف مضبوط پائپ کی ریلنگ اور خورد و نوش کے لئے ایک کنٹین بھی ہے۔ ایسے متعدد نئے جہاز دن بھر بحر مرمرہ کو آبنائے باسفورس کے قریب تر مقام سے کم تر فاصلہ عبور کر کے گاڑیوں کو استنبول کے یورپی ساحل پر جا اتارتے ہیں۔ ہماری بس سمیت چھ سات بڑی گاڑیاں اور درجنوں چھوٹی بڑی کاریں جہاز میں سما گئیں۔ میں اوپر کی منزل سے ظاہر ہے کہ کسی ایک طرف کی تصویر ہی لے سکتا تھا جو اسی صفحے پر موجود ہے۔ اسے اگلے پچھلے حصے کے حساب کے لئے دو سے ضرب دیجئے اور رقبے میں اس سے دگنا درمیانی حصے کے لئے جمع کر لیجئے تو یہ وہ جہاز بنتا ہے جو وہاں "فیری سروس" کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

بحر مرمرہ عبور کرنے کے بعد مغرب کے وقت لگ بھگ تیس چالیس میل کا مزید فاصلہ شاہراہ پر طے کر کے ہم استنبول کے بس ٹرمینل جا پہنچے اور وہاں سے بس کمپنی ہی کی ایک ویگن نے ہمیں ہوٹل مرمرہ پہنچا دیا۔ اگلی صبح محض ایک دفعہ کی سوکھی چائے' پانی کی چند بوتلوں اور لاہور کی چار پانچ مختصر ٹیلی فون کالوں کی ادائیگی میں لاکھوں ترکی لیرے ہوٹل کے کاؤنٹر پر ادا کر کے ہم فارغ ہوئے اور ایئرپورٹ کی راہ لی جہاں سے ہمیں کراچی کے لئے پی آئی اے کی پرواز پکڑنی تھی۔ ہوٹل کے ان برائے نام ضمنی واجبات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن آف نارتھ امریکہ کو ہماری میزبانی کس بھاؤ پڑی ہوگی۔ شکاگو کے ڈاکٹر خورشید ملک اور ڈاکٹر طور نے برادر محترم ڈاکٹر اسرار احمد کو تو بہت اصرار سے بلایا تھا' میں خود ان

دونوں مہمان دوستوں کا شکریہ کس منہ سے ادا کروں !۔ اللہ انہیں جزائے خیر دے' مجھے انہوں نے ترکی دکھا دیا جسے دیکھنے کی بڑی حسرت تھی -- اور اب آپ سے کیا پردہ' سیری ابھی نہیں ہوئی۔ جی چاہتا ہے کہ ایک بار پھر جاؤں اور کم سے کم ایک مہینہ وہاں گزار کے اپنے قریب ترین شاندار ماضی کا زیادہ گہرا مشاہدہ کروں جس کے نقوش تاحال تازہ ہیں لیکن اب صحت ساتھ دینے سے انکاری ہے' یہ خواہش بھی ایک اور حسرت ہی کے قالب میں ڈھل جائے گی۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

وہ دن آخر تو آنا ہی تھا جب یہ سوچ کر حسرتوں کو بھی تمناؤں کے ساتھ تھپکی دینے کی ضرورت ایک مجبوری بن جاتی ہے کہ۔

ضعفِ پیری بڑھ گیا' جوشِ جوانی گھٹ گیا
اب عصا بنوایئے نخلِ تمنا کاٹ کر

(باقی باقی)

بقیہ : مغربی تہذیب

لیگ' جماعت اسلامی' اے۔ این۔ پی اور جمعیت علماء اسلام وغیرہ شامل ہیں۔ ان جماعتوں کے متعدد اکابرین تشریف بھی لائے۔ مولانا اکرم اعوان صاحب اچانک علالت کی وجہ سے شرکت نہ کر سکے' تاہم تنظیم الاخوان کے نمائندے تشریف لائے۔

پروگرام کا آغاز مغرب کے بعد ہوا۔ امیر محترم کا خطاب پونے دو گھنٹے پر مشتمل تھا۔ اس کے بعد سوال و جواب کی نشست تھی۔ ہم نے اگرچہ ۳۵۰ افراد کی حاضری کا تخمینہ لگایا تھا لیکن حاضری ۵۵۰ تک پہنچ گئی' جس کی وجہ سے مزید کرسیوں کا انتظام کیا گیا۔ لیکن یہ انتظام بھی ناکافی ثابت ہوا۔ ظاہر بات ہے کہ ایسی صورت میں دیر سے آنے والوں کو لازماً کھڑا ہو کر ہی تقریر سننا پڑی۔ تقریر کے اختتام پر سوال و جواب کی نشست بہت دلچسپ رہی' جس کے بعد نماز اور پھر طعام کا پروگرام تھا۔ نظم اور موضوع کے حوالے سے بعض شرکاء کا تاثر یہ تھا کہ اس ہال میں اس نوعیت کا یہ پہلا پروگرام دیکھنے میں آیا ہے۔

دو گھنٹے کے اس پروگرام میں امیر محترم کی تقریر کا حاصل یہ تھا کہ یہ تہذیب اب مردہ ہو چکی ہے۔ اب اس کا احیاء کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کے برعکس دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ تہذیب اپنے بام عروج پر پہنچ چکی ہے اور کمیونزم کے خاتمے کے بعد سے اس نے اپنی برتری ثابت کر دی ہے۔ اس سب کے باوجود یہ تہذیب اپنی حریف دو تہذیبوں سے سخت خائف ہے' ان میں سے ایک اسلامی تہذیب و تمدن ہے۔ اس کے حوالے سے بنیاد پرستی کو آڑ بنا کر اسلام کے خلاف شدید پروپیگنڈہ اور مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگوں کا آغاز' پہلے بوسنیا میں اور اب چیچنیا میں ہو چکا ہے۔ دوسری تہذیب کنفیوشس کی تہذیب ہے' جس کا علمبردار چین ہے۔ اس کے گرد گھیرا تنگ کر رہے ہیں' جس کی حالیہ مثال امریکی بھارتی دفاعی معاہدہ ہے۔ مسلمان ممالک اور چین کے درمیان اختلافات پیدا کرنا بھی اسی حکمت عملی کا حصہ ہے کہ کہیں یہ دونوں تہذیبیں مل کر ان کے لئے کوئی چیلنج نہ کھڑا کر دیں۔ مسلمان ملکوں کو تباہ کرنے کے لئے ان کے گروہی اور مسلکی اختلافات کو ابھارا جا رہا ہے' جس کی مثال پاکستان کے شیعہ سنی فسادات ہیں۔ اسی طرح مغربی قوتوں کی پوری کوشش ہے کہ مسلمان ممالک کو کسی طرح بھی ایٹمی قوت نہ بننے دیا جائے۔ اس کی ایک مثال مغرب کے پالتو اسرائیل کی ایران کو دھمکی ہے۔ امریکہ اور اس کے حلیف پاکستان کے جوہری پروگرام کو بالکل ختم کر دینے پر تل گئے ہیں۔

مغربی تہذیب میں جہاں بہت سی خرابیاں ہیں' وہاں اس میں دو خوبیاں بھی کمال پر ہیں۔ پہلی خوبی یہ ہے کہ توہمات کی جگہ دلائل سے بات کرنا جبکہ دوسری یہ کہ منطق کی بجائے عملی سائنس اور ٹھوس حقائق کی بنیاد پر اپنی بات کی بنیاد رکھنا۔ سائنسی علوم کی اعلیٰ پیمانے پر تعلیم اور نشرواشاعت اور بڑے بڑے سائنسی اداروں کا قیام' نیز قرآن سے استفادہ کر کے اپنے معاشی و سیاسی مسائل کا حل دریافت کرنا' اس تہذیب کی امتیازی خصوصیات ہیں۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کی تاریخی دشمنی کو دوستی میں بدل دیا گیا ہے اور یہودی قوم اپنے سازشی ذہن سے پوری دنیا کی مالیات پر IMF اور ورلڈ بنک کے ذریعے کنٹرول حاصل کر رہی ہے یہود و نصاریٰ نے اپنے گٹھ جوڑ سے عالم عرب کو اپنے زیر نگیں کر لیا ہے۔ اب اس کے بعد ایران و پاکستان اور دوسرے غیر عرب ممالک کی باری ہے۔ اسرائیل کا ایک طبقہ صرف دنیا پر معاشی تسلط چاہتا ہے جبکہ دوسرا گروہ گریٹر اسرائیل کے قیام سے کم پر بالکل راضی نہیں ہے۔

مسلمانوں کو اس تہذیب کا مقابلہ کرنے کے لئے جوش کی بجائے ہوش سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ جوشِ محض سے انتہائی قیمتی جانیں ضائع ہو رہی ہیں اور حاصل کچھ بھی نہیں ہو رہا۔ اس شیطانی تہذیب کو قرآنی فکر سے شکست دینے کی ضرورت ہے۔ یعنی اللہ پر کامل اور مضبوط ایمان' قرآن پر ایمان اور آخرت کا یقین جو عمل کو بھی ٹھیک کر دے۔ قرآن پر گہرا غور و فکر حقیقی ایمان کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ ایمان کا منبع و سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ وہ لوگ جو اس ایمان کے حامل ہوں' مل کر "حزب اللہ" بنائیں اور اس کے ذریعے پہلے کسی ایک ملک میں اور بالآخر پوری دنیا میں اللہ کے دین کو غالب کر دیں۔

امیر محترم نے اپنی گفتگو کے اختتام میں فرمایا کہ پاکستان کے سیاسی حالات مخدوش اور سخت دگرگوں ہیں لیکن میں اس کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں۔ انہوں نے کہا کہ بڑے ذمہ دار لوگ یہاں موجود ہیں لہٰذا میری یہ آواز اونچے ایوانوں تک پہنچائی جائے کہ پاکستان ایٹمی دھماکہ کر کے ایٹمی کلب کا ممبر بن جائے' کیونکہ ہندوستان ۱۹۷۴ء میں ایسا کر چکا ہے۔ ہمارے ایٹمی پروگرام کو شدید خطرہ ہے۔ ہمیں ایران کی بھی اس سلسلے میں مدد کرنی چاہئے۔ ایٹمی قوت ہی ہمارے دفاع کی واحد موثر صورت ہے۔ ہمیں کسی صورت بھی اس سے دستبردار نہیں ہونا چاہئے۔OO

بقیہ : جمہوریت کے اسیر

اللہ تعالیٰ عادل ہے اور اس کا نظام عدل پر مبنی ہے' جب کہ انسان قرآن کے الفاظ میں "ظلوماً جھولاً" ہے لہٰذا اس کا وضع کردہ نظام ظلم کا نظام ہے۔ ایک دن انشاء اللہ لوگ اس حقیقت کو پالیں گے کیونکہ غیر الہامی مذہب کے ماننے والے چینی افیون خوری سے نجات حاصل کر کے آمرانہ نظام سے ٹکر لے سکتے ہیں تو قرآن کریم کے ماننے والے ظالمانہ نظام کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر عادلانہ نظام کیوں قائم نہیں کر سکتے۔OO

تیرے آباء کی نگہ بجلی تھی جس کے واسطے
ہے وہی باطل ترے کاشانہ دل میں مکیں
غافل اپنے آشیاں کو آ کے پھر آباد کر
نغمہ زن ہے طور معنی پر کلیم نکتہ بیں

مدیر نوائے وقت کا سوال یا تجاہل عارفانہ کا ایک شاہکار

ہم کب تک جمہوریت کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر رہیں گے؟

مروجہ سیاست کے دو متوالوں کے ذکر میں کشمکشِ اقتدار پر لعنت بھیجنے والوں کو کیوں رگڑ دیا گیا؟

میم سین کراچی

جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ جمہوریت کا جادو بھی ایسا ہی ہے جو ہمارے سیاسی حلقوں میں سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ صحافت جو سیاسی نظریات کی تبلیغ کا ایک اہم ذریعہ ہے' اس پر بھی اس جادو کا کم اثر نہیں۔ اس کے باوجود کہ نصف صدی کے لگ بھگ کے عرصے میں جمہوریت ہمارے ہاں پروان نہیں چڑھ سکی۔ نتیجتاً ملک دولخت ہوا۔ قوم قومیتوں میں بٹی۔ اس پر مستزاد مذہبی فرقہ واریت نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ آج صورت حال یہ ہے کہ قومیتوں کے علمبردار اور مذہبی فرقہ پرست سب باہم جنگ و جدال اور قتل و قتال میں مصروف ہیں۔ یوں تو پورا ملک ہی فتنہ و فساد کی آماجگاہ بنا ہوا ہے لیکن صوبہ سندھ کا تو حال ہی برا ہے۔ کبھی جناح پور یا لیاقت آباد کی باتیں ہیں تو کبھی فری پورٹ کے نعرے ہیں۔ کہیں سندھو دیش کا نعرہ مستانہ ہے' اور اب گوادر کا مسئلہ درپیش ہے۔ دہشت گردی میں اگر سیاسی جماعتیں ملوث ہیں تو ڈکیتیوں اور کار لفٹنگ کے پسِ پشت یہی عناصر کارفرما ہیں۔ امریکہ جو کبھی ہمارا دوست ہوا کرتا تھا' اب ہمارے دشمن ہندوستان سے دوستی کی پینگیں بڑھا رہا ہے۔ امریکہ کی یہود و ہنود کی سرپرستی کیا رنگ لائے گی وہ ایک عام آدمی بھی سمجھ سکتا ہے۔ لیکن ہم ہیں کہ جمہوریت کی نیلم پری سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

ایسی صورتحال میں جب ہمارے صحافتی حلقے اس جماعت کو جمہوریت نوازی کا مشورہ دیں جو کبھی ایک دینی تحریک ہوا کرتی تھی اور اب ایک قومی سیاسی جماعت بن کر رہ گئی ہے اور یہ سب اسی "بی جمہوریت" سے عشق کے نتیجے میں ہوا' جس کے چکر میں پہلے تو دینی اصول ترک کئے گئے اور پھر اسلامی فرنٹ کے نام پر' اسلام سے فرنٹ ہو کر غیر اسلامی طور طریقے اپنائے گئے۔ یہ مشورے ان کے اس لیڈر کو دیئے جا رہے ہیں جو ظالموں کو مٹانے کے لئے کھڑا ہوا تھا لیکن جس کے مظالم نے اس کی اپنی جماعت کا تیاپانچہ کر کے رکھ دیا ہے۔ وہ جماعت جس پر لوگوں کو اعتماد تھا کہ اگر اسلامی انقلاب برپا کرنے کی کسی میں صلاحیت ہے تو صرف اسی جماعت میں ہے۔ لیکن جب قوم پرستوں کے نقشِ قدم پر اس کے کارکنوں کو بھنگڑا ڈالتے اور اپنے لیڈر کی قد آدم تصاویر اٹھائے اس کے قصیدے پڑھتے دیکھا تو اسلامی انقلاب کی توقع رکھنے والے بھی مایوسی کا شکار ہو گئے ہیں۔ ووٹر ٹوٹے' جماعت شکست و ریخت سے دوچار ہوئی لیکن ان کا لیڈر ہے کہ آج بھی اسی جمہوری نظام کے چکر میں ہے اور توقع رکھتا ہے کہ اس کے ذریعہ وہ اسلامی انقلاب برپا کر سکے گا۔ اس کو اگر یہ نصیحت کی جائے کہ وہ جمہوری نظام کی اصلاح کرے تو تعجب ہوتا ہے۔ اگر بزعم خود دیانت دار قیادت اور منظم جماعت نصف صدی میں بھی جمہوری نظام میں اصلاح نہ کر سکی بلکہ خود اصلاح کی محتاج ہو گئی ہے تو اور کتنا عرصہ اس کو درکار ہو گا کہ جس میں وہ اس جمہوری نظام میں اصلاح کر لے گی۔

ہمیں اس صحافیانہ مشورے پر کوئی اعتراض نہیں کہ یہ شمع جمہوریت کے دو پروانوں کا آپس کا معاملہ ہے۔ لیکن ہمیں حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ محترم قاضی حسین احمد پر گولہ باری کرتے کرتے مدیر نوائے وقت کے توپ کے گولے کا رخ محترم ڈاکٹر اسرار احمد کی جانب کیوں مڑ جاتا ہے۔ محترم ڈاکٹر اسرار احمد کو تو "دین و دل" اتنا عزیز ہے کہ اس نصف صدی میں ایک لمحے کے لئے بھی انہوں نے کوچہ جمہوریت کا کبھی رخ نہیں کیا۔ وہ جانتے ہیں کہ جس طرح گدھی کے بطن سے گھوڑے کا بچہ برآمد نہیں ہو سکتا' اسی طرح جمہوریت کے بطن سے اسلامی نظام برآمد نہیں ہو سکتا۔ وہ یہ دورنگی اختیار نہیں کر سکتے کہ جمہوری نظام کے وضع شدہ دستور کی پابندی کا حلف اٹھائیں اور اسی نظام کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کا عزم کریں۔ اس لئے کہ اسلام سے انہیں سبق ملا ہے کہ اگر کافر سے بھی معاہدہ ہو جائے تو مسلمان کا اس عہد پر قائم رہنا لازم ہے۔ للہٰذا جب وہ جانتے ہیں کہ جمہوریت کے ذریعہ کسی نظام کو چلایا جا سکتا ہے' اسے تبدیل نہیں کیا جا سکتا تو وہ اس کے چکر میں پڑیں ہی کیوں۔

فاضل مدیر فرماتے ہیں کہ "قبلہ ڈاکٹر صاحب بھی تحریکِ خلافت اور اسلامی انقلاب کے داعی کے طور پر شہرت رکھتے ہیں' لیکن خلافت کون نافذ کرے اور انقلاب کون لائے اس کا جواب ابھی خواہش رکھنے والوں کے پاس نہیں ہے"۔ فاضل مدیر تو میری حقیر رائے میں تجاہل عارفانہ سے کام لے رہے ہیں ورنہ عالمی سیاست پر نظر رکھنے والے سے کوئی کیونکر توقع کر سکتا ہے کہ وہ ان سوالوں کے جواب سے ناواقف ہو جبکہ ان موضوعات پر محترم ڈاکٹر اسرار احمد کے کئی ایک مضامین خود انہیں کے اخبار میں اور اسی صفحہ پر شائع ہوتے رہے ہیں' جس پر ان کے اداریئے شائع ہوتے ہیں۔ اصل میں ان کی اس بے اعتنائی اور طنز و تمسخر کی وجہ صرف یہی ہے کہ جمہوریت کے پیروکار سیاست دانوں نے اسلام کے حرام کردہ سودی نظام میں ملک کو اس طرح جکڑ رکھا ہے کہ جس کے نتیجے میں امیر روز بروز امیر تر اور غریب غریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس پر مستزاد آسمان سے باتیں کرتی ہوئی مہنگائی نے اسے مجبور کر رکھا ہے کہ اپنے اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے صبح سے شام تک لدو بیل کی طرح لگا رہے۔ للہٰذا اسے اتنی فرصت نہیں کہ وہ اس بات کو سمجھ سکے کہ حکمران حقیقی کا وضع کردہ خلافت کا نظام مخلوق کے وضع کردہ جمہوری نظام سے بہتر ہے۔

(باقی صفحہ ۲۲ پر)